اردو نعت

کا

شرعی محاسبہ

شمس بدایونی

S. No. 25161

٦٧
١٨٨

25161
148/067
0006461

اردو نعت

کا

شرعی محاسبہ

شمس بدایونی

(حقوق طباعت محفوظ ہیں)

پہلی اشاعت

۱۹۸۸ء

تعداد

۶۰۰

قیمت فی جلد

۱۵/ پندرہ روپے

کتابت

الطاف الرحمن

ملنے کا پتہ

روشن پبلیکیشنز روشن محل سوتھا، بدایوں۔ یوپی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی علیگڑھ، بمبئی

PRICE Rs. 15/

شہید انسانیت

الحاج مولانا محمد روشن مرحوم کے نام

جن کے کردار (حق پرستی و بیباکی، خداترسی و دلداری، علم پروری
و دینداری) نے میری ذہنی تعمیر و تہذیب کی۔

حقائق کے پرستاروں کے خوابوں کو کچل ڈالا
مگر کچلے ہوئے خوابوں کی تابانی نہیں جاتی

ترتیب

○ دیباچہ — مصنف — ۶۶

○ باب اول
نعت نبی۔ آغاز و سفر — ۹۹

○ باب دوم
شعر و نعت کی شرعی حیثیت — ۱۸۱۸

○ باب سوم
نعت نبی کے غیر مشروع موضوعات — ۲۷

○ باب چہارم
نعت نبی کے مشروع موضوعات — ۸۹

○ شرعی اصطلاحات — ۹۴

S. No. 25161
148|067
6461

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ ط

دیباچہ

زیرِ نظر مقالہ دراصل راقم الحروف کی ایک کتاب "شعرائے بدایوں دربارِ رسولؐ میں" کا مقدمہ تھا لیکن اس کے طول طویل اور کتابِ مذکور سے کسی حد تک بے تعلق ہو جانے کے سبب اس کو کتاب سے الگ کر کے نظرِ ثانی کی گئی اور اسے ایک مستقل مقالہ کی شکل دیدی گئی۔ اسطرح یہ اپنی اہمیت اور مقصدیت کے لحاظ سے ایک کارآمد مقالہ بن گیا۔

نعت گوئی کا رواج قرنِ اول سے چلا آرہا ہے۔ اردو شاعری نے جب اپنے پر پُرزے نکالے تو نعت کا چلن اُردو میں بھی ہو گیا لیکن نعت کا شرعی محاسبہ آج تک کسی نے نہیں کیا۔ یوں تو اردو میں بھی فن نعت گوئی پر مقالے بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ چند ایک کتابیں بھی منظرِ عام پر آئیں لیکن کسی بھی مقالہ و کتاب میں نعت کو اسلامی فکر اور شریعت محمدی کی روشنی میں نہیں دیکھا گیا کیونکہ یہ مقالے اور تصانیف اردو شاعری کے عام رُجحانات اور تنقید کے عام مزاج سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔

راقم الحروف نے اس مقالہ میں نعت سے متعلق موضوعات کا شریعتِ محمدی کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور نعت کے حُسن و قبح کو سمجھنے کے لئے خالص اسلامی فکر (جو علم و عمل، عقیدہ و عقیدت وغیرہ کا احاطہ کرتی ہے) کو ضروری قرار دیا ہے راقم الحروف نے یہ مقالہ بڑے غور و خوض اور تحقیق و تلاش کے بعد ادب و اسلامیات کی روشنی میں ترتیب دیا ہے۔ گو یہ ایک مقالہ ہے اور مقالہ اپنے تحریری تسلسل کی وجہ سے عنوانات کا متحمل نہیں ہوتا، لیکن زیرِ نظر مقالہ قابلِ ذکر طوالت کی وجہ سے

متقاضی تھا کہ اِسے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ اسکی طوالت قارئین کے اذہان پر بار نہ ہو اور قاری کا ذہن عنوان کے تحت بیان کردہ مضمون کیطرف متوجہ ہو جائے۔ چنانچہ اس مقالہ کو بلحاظ موضوعات چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں نعت کی لُغوی اور اصطلاحی تعریف اسکی ہیئت و ابتدار، اسکی مختلف شکلیں اور اسکے تاریخی سفر وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں شعر گوئی کا اسلامی تصوّر، نعت نبیؐ کی شرعی حیثیت، اُلوہیت اور نبوت کی تحدید، غلو سے گریز وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ تیسرا باب نعت کے غیر مشروع موضوعات پر مشتمل ہے جسکے کئی ایک ذیلی عنوانات ہیں۔ دراصل یہ باب ہی اصل محاسبہ اور وجۂ تصنیف ہے۔ چوتھا باب نعتِ نبی کے مشروع موضوعات کی طرف مشیر ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ سنجیدہ اور روشن خیال حضرات خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ کریں گے۔

یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ نعت کے 'غیر مشروع موضوعات' کے ضمن میں جن موضوعات پر تحقیقی گفتگو کی گئی ہے وہ اُن عقائدِ ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہیں کہ جن پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے۔

علاوہ ازیں ایک بات اور بھی عرض کر دوں کہ بعض طویل روایات کے بعض اختصار صرف وہی حصص میں نے اپنے الفاظ میں بیان کئے ہیں جو مسئلہ زیرِ بحث سے متعلق ہیں البتہ روایات کی رُوح اور ان کے اصل مفہوم کو مسخ ہونے نہیں دیا ہے۔ پوری روایات اور انکی اصل عبارت کتب محوّلہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس مقالہ میں بعض شرعی اصطلاحوں کا بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ اصطلاحیں اپنے مفہوم کے ساتھ اس مقالہ کے آخر میں یکجا کر دی گئی ہیں لہذا اس مقالہ

کے مطالعہ سے قبل ان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

میں محبِ قدیم اور مخلص صمیم سید شاکر علی نقوی کا بیحد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مقالہ کے سلسلہ میں بعض مفید مشوروں سے نوازا اور اسکی اشاعت میں مجھے بھرپور تعاون دیا۔ ان کی یہ علم دوستی میرے لئے قابلِ قدر ہے۔

میں اپنے عم محترم جناب عبدالحلیم صدیقی کا بھی ممنون ہوں جن کے اسلامی مطالعے سے بارہا مجھے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے اور جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں دامے درم سے بھی تعاون دیا۔ اس عنایت و محبت کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

شمس بدایونی

روشن محل

سوتھا، بدایوں

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۷ جون ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

نعتِ نبیؐ — آغاز اور سفر

نعت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ن، ع، ت، ہی ہے جسکے معنی ہیں تعریف۔ اسکی جمع نعوت ہے۔ جب یہ لفظ فعل کی صورت میں باب فَتَحَ، یَفْتَحُ سے آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں تعریف کرنا یا بیان کرنا کسی شخص کا صفاتِ حسنہ کے ساتھ۔ غیاث اللغات میں لکھا ہے:

"نعت بالفتح، تعریف و وصف کردن از منتخب۔ اگرچہ لفظ نعت بمعنی مطلق صفت ست لیکن اکثر استعمال ایں لفظ بمعنی مطلق ستائش و ثنائے رسول اللہ صلعم آمدہ است، بمعنیٰ و صیغۂ اسم فاعل و اسم مفعول و صیغۂ صفت مشبہ نیز می آید"

مؤلف 'قاموس' اس لفظ کے معنیٰ مطلق صفت قرار دیتے ہیں۔ 'بہارِ عجم' کا مؤلف بھی اس معنیٰ سے اتفاق کرتا ہے اور مثال میں فارسی کی چند ابیات نقل کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

جاوید ہمی باش بایں نعت بایں وصف
پاکیزہ باخلاق و پسندیدہ با افعال

ناپدید آید ہمی نعتِ جوانی در بہار
ہمچناں چوں وصف پیری از خزاں آمد پدید

ہمیشہ سمع و بصر ہست نعت او لیکن
بری ز آلت سمع و ز آلتِ بصر است

وصفش ہمہ تقدیس ز پیوند و ز فرزند
نعتش ہمہ تنزیہہ ز امثال ز اقران

اصطلاحاً لفظ 'نعت' سے ایک خاص قسم کی شاعری مُراد لیجاتی ہے جسمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ شخصیت کا تعریف و توصیف کی شکل میں بیان ہوتا ہے نعت دراصل ایک مضمون یا موضوع کا نام ہے لہذا جب لفظ نعت کا استعمال کیا جاتا ہے تو وہ تمام ذخیرہ مراد ہوتا ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل مناقب اور شمائل پر مشتمل ہے خواہ نثر میں ہو یا نظم میں۔ نثری نعت کو اصطلاحاً 'محامد رسول' کا ایک جُدا نام دے سکتے ہیں[1] لہذا مسلم شریف کا باب 'کتاب الفضائل' (فضائل متعلقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور بخاری شریف کا باب 'کتاب المناقب القریش' امام ترمذی کی کتاب 'شمائل ترمذی' حتیٰ کہ 'درودِ تاج' بھی اسی نثری نعت کے تحت آتا ہے۔ ماضی میں بھی ان نثری محامد کو نعت ہی سمجھا گیا ہے۔ قرآن کریم کی آیات جن پر نعت رسول کا اطلاق ہوتا ہے وہ بھی اسی اصطلاح کے زمرہ میں آئیں گی۔ مثلاً لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ اور وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ وغیرہ

---

[1] نعت نگاری اتر پردیش میں۔ علی جواد زیدی مطبوعہ 'تحریر'، دہلی جلد ۲ شمارہ ۲ ۱۹۶۱ء

٦٧ / ٢٢٤
25181
148/067
0006461

نعت کی کوئی مسلمہ ہیئت (FORM) اور ٹیکنک نہیں ہے در اصل نعت نظم کی ایک قسم ہے جب کہ غزل، مثنوی، قصیدہ، مستزاد، مسمط وغیرہ شعر کی اقسام ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نعت کا تعلق موضوع و مواد سے ہے۔ خارجی ہیئت و طرز سے نہیں۔ لہٰذا اسے شعر کی مختلف اقسام میں لکھا گیا۔

مجازی عشق کی طرح نعتِ رسول کا اظہار بھی شعر کی ہر قسم میں ہو سکتا ہے۔ چونکہ شعرا، نعتِ رسول کے معاملہ میں بہت محتاط تھے لہٰذا انھوں نے نعتیہ شاعری کو مجازی شاعری کے الفاظ و بیان سے بچانے کی کوشش کی نتیجۃً وہ نہ ادبی حیثیت حاصل کر سکی اور نہ ہی علمائے عروض کی توجہ کی مستحق بنی۔ یہ ایک المیہ تھا جو نعت کی صنفی حیثیت کی تشکیل میں ایک رکاوٹ (OBSTRUCTION) بن گیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شعری اصناف کے عروج و زوال کا تعلق بڑی حد تک معاشرتی اور سیاسی ماحول سے ہے غزل کو چھوڑ کر تمام اصناف شعر اپنے جدا جدا دَور میں مقبول و مروّج ہوئیں اور ان کے رواج و فروغ پانے کے ذمہ دار کچھ سیاسی و تہذیبی عوامل تھے لیکن نعت کو نہ تو ایسا کوئی دور ملا اور نہ وہ سیاسی و تہذیبی عوامل ملے جو اس کے فروغ کا سبب بنتے ماضی میں نعتیہ شاعری اور شاعر کو کوئی مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ اُردو تذکروں میں نعت گو شعراء کا ذکر یکسر مفقود ہے اور اگر کسی تذکرہ میں ضمنی طور پر کسی شاعر کا ذکر آ بھی گیا ہے تو اسے امتیازی طور پر نعت گو شاعر کہہ کر متعارف نہیں کرایا گیا۔ یہ تاریخی حقیقت متذکرہ بالا خیال کی شاہد ہے کہ ماضی میں نعت کی حیثیت کوئی صنف سخن کی نہیں تھی۔ یہ ایک موضوع تھا جسے رسم و روایت کے طور پر خاص

خاص موقعوں پر نظم کیا جاتا تھا۔ لہٰذا نعت کو آج تک موضوع یا مضمون مانا جاتا ہے، کوئی صنفِ سخن نہیں۔

شاعری میں نعت کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ اس کا جواب چند لفظوں میں بآسانی دیا جا سکتا ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کی تبلیغ کی اور فاران کی چوٹی پر کھڑے ہو کر یہ نعرہ بلند کیا۔ "یا ایھا الناس قولو لآ اِلٰہ اِلّا اللہ تفلحوا" تو کفر و شرک کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ صدیوں سے پوجے جانے والے خود ساختہ معبودوں پر یہ ایک ایسی کاری ضرب تھی کہ ابکے پجاری تلملا اُٹھے۔ تلواریں بھی میانوں سے نکلیں اور زبان سے مغلظات کے طوفان بھی پھوٹے۔ عرب شعراء نے اپنے معاندانہ جذبات کی تسکین کیلئے آپؐ کی شانِ اقدس میں ہجویات بکیں، قبیلہ قریش کے تین شخص عبداللہ بن زبعری ابوسفیان بن حارث اور عمر بن عاص آنحضورؐ کی مستقل ہجو بکتے تھے۔ ان ہجویات و مغلظات کا جواب مغلظات سے نہیں دیا گیا۔ اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی نکھری ہوئی اقدار اسکی متقاضی نہ تھیں۔ لہٰذا ان کا جواب آنحضور کی تعریف و توصیف سے دیا گیا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ (ف ۶۷۳ء) دربارِ رسالت کے پہلے شاعر تھے جنہیں مشرکین کی مغلظات اور ہجویات کا جواب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کی شکل میں دینے کیلئے مقرر کیا گیا۔ یہ تھا نعت گوئی کا نقطۂ آغاز جہاں سے نعت گوئی کا سفر شروع ہوا۔ تاریخ اسلام میں جو تین نعت گو شعراء "شعرائے رسول الثقلین" کے معزز خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں

وہ یہ ہیں: حضرت حسان بن ثابتؓ، عبداللہ بن رواحہؓ اور کعب بن زہیرؓ۔ یہ تینوں شعراء دربار رسالت کے شاعر تھے جنھیں آنحضورؐ کی زبانِ مبارک سے تحسین وآفریں کے تمغہ جات عطا ہوئے۔

نعتیہ شاعری کی عرب شعراء نے خوب خوب آبیاری کی لیکن جب دولت عباسی کے آخری خلیفہ معتصم باللہ کی ناعاقبت اندیشی سے عربوں کی جاہ وحشمت انحطاط پذیر ہوئی تو عجمیت کا غلبہ ہوا اور ایرانی تہذیب نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ مآل آخر فارسی شاعری نے عربی شاعری کی جگہ لے لی یہاں تک کہ فارسی میں بھی نعتیہ شاعری کا آغاز ہوا۔ اور اسطرح نعتیہ شاعری ایران اور توران (ترکستان) ہوتی ہوئی ہندوستان میں وارد ہوئی۔ نظامی۔ رومی۔ عطار۔ سعدی۔ جامی قدسی۔ امیر خسرو وغیرہ نے فن نعت گوئی کو عروج پر پہنچایا لیکن عرب شعراء کی طرح فارسی شعراء کی مساعی بھی صنفی حیثیت سے قصائد ہی کے ضمن میں آتی ہیں البتہ جامی کی مسلسل غزلیں نعت گوئی کے موجودہ اظہار بہ انداز غزل کا پہلا تجربہ کہی جاسکتی ہیں۔

اردو شاعری میں نعت گوئی ہر شاعر وادیب کی بسم اللہ بنی۔ مدحیہ قصیدوں، طبع زاد داستانوں اور مثنویوں کا آغاز بطور تبرک وتقدس حمد باری تعالیٰ کے ساتھ نعتیہ اشعار سے کیا جانے لگا اور پھر نعت گوئی اُردو میں بھی اظہار جذبات اور عقیدت ومحبت کا ذریعہ بن گئی جسکی مثالیں قدیم دواوین میں بکثرت مل جاتی ہیں۔

نعت کا سفر خاصا طویل ہے۔ نعت شعر کی مختلف اقسام کو اپنی منزل

بناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ پس قصائد، معراج نامے (جو مثنوی کی طرز پر لکھے گئے)، معجزات وغزوات نبوی، ولادت مبارکہ، میلاد و مناجات وغیرہ کو نعت کے احاطے سے کسی طرح باہر نہیں سمجھا جاسکتا۔ قصائد کے باب میں سودا، میر، مومن، شہیدی بریلوی، خاکی، امیر مینائی، محسن کاکوروی اور عزیز لکھنوی نے خاص شہرت پائی۔ ان لوگوں کے نعتیہ قصائد مطبوعہ موجود ہیں۔

نعت کی ایک شکل جیساکہ عرض کیا گیا معراج نامہ بھی ہے 'معراج نامے' نثر میں بھی لکھے گئے اور نظم میں بھی۔ نظم میں سب سے پہلا معراج نامہ سید میراں ہاشمی (دکن) کی جودت طبع کا نتیجہ ہے۔ بعدازاں متعدد 'معراج نامے' لکھے گئے ان میں ہاشم بیجاپوری، اعظم دکنی، مجتبیٰ مہدی، شاہ کمال الدین، سید بلاقی حیدرآبادی معظم بیجاپوری۔ مختار نصرتی، ولی ویلوری، لچھمی نرائن شفیق، شاہ ابوالحسن قربی وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں میر قدرت اللہ قاسم کی 'حقائق معراج' میر مظفر حسین ضمیر لکھنوی کی 'ریحان معراج'، سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی کی لیلۃ الاسریٰ اور علی احمد خاں اسیر بدایونی کی 'نظم المعراج' مثال میں پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ تمام معراج نامے مثنوی کی ہیئت اور ٹیکنک میں لکھے گئے ہیں۔

سوانح، ولادت، معجزات اور غزوات نبوی سے متعلق منظوم کتب کی تعداد بھی خاصی ہے۔ عبدالمجید تزین کی 'شمائل نبوی'، میر فیاض علی ولی ویلوری کی 'روضۃ الانوار'، سیدالدین سعید عثمانی کی 'سیرت پاک منظوم'، محمد علی خاں شاہین اشرف بدایونی کی 'بہار سیرت'، میر احمد رسا کی کتاب 'معجزہ نبوی'، علی احمد خاں

اسیر بدایونی کی مثنوی 'نظام الشہود (متعلقہ ولادت) اور مجتہدین احمد عیش بدایونی کی مثنوی 'مولود پیغمبر' وغیرہ کافی مشہور ہیں، میلاد و مناجات وغیرہ کا رواج ہمارے یہاں چونکہ عام ہے اسلئے بے شمار گلدستے جو میلاد اور مناجات پر مشتمل ہیں ہمیں ملتے ہیں میلاد پر سب سے پہلی کتاب گیارہویں صدی ہجری کے واخر میں 'مولود' سامنے آئی۔ اس کا مصنف دکنی شاعر فتاحی تھا۔ یہ مولود کی پہلی کتاب اپنے طرز اور انداز بیان میں منفرد تھی۔ چنانچہ اس کی مقبولیت کے ساتھ ہی اردو میں میلادناموں کا سلسلہ چل پڑا۔ مختار (ہمعصر فتاحی) کا 'مولود نامہ' بھی ابتدائی میلادناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تمام میلادناموں کی فہرست تیار کرنا اگرچہ مشکل ہے تاہم چند مشہور میلادناموں کی مختصر سی فہرست حسب ذیل ہے:

مولود شہیدی	غلام امام شہید الہ آبادی
مولود سعیدی	محمد علی خاں سعید لکھنوی
زیورِ ایمان (خواتین کیلئے)	" " " "
میلاد رسول	مولوی حفیظ اللہ بندہ بدایونی
خدا کی رحمت	شاہ سلامت اللہ کشفی بدایونی
مولود اکبر	خواجہ محمد اکبر خاں اکبر وارثی
مولود منظوم	شاہ فضل الرسول قادری مست
میلادنامہ	خواجہ حسن نظامی
میلاد مقبول	کیف المسلمی (امروہوی)

میلاد گوہر منشی گوہر علی خاں گوہر رامپوری

اُردو میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا نعت گوئی ہر شاعر کی بسم اللہ بنی لیکن بعض شعراء نے اس پر سنجیدگی سے طبع آزمائی کی۔ ابتدائی دکنی شعراء میں سید محمد فراقی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، نصرتی، وجہی، ابن نشاطی سراج، ولی وغیرہ نے خوب خوب نعتیں کہی ہیں۔ شمالی ہند میں سودا، ذوق، بیدار وغیرہ کے دواوین میں نعتیہ کلام موجود ہے۔

نعت کو غزل کی فارم (FORM) میں کہنے کا اُردو میں پہلا تجربہ فدوی خاں فدوی اور میر محمد شریف منتوں نے کیا۔ لیکن اُردو شعراء میں مومن اُن اولین نعت گویوں میں ہیں جنھوں نے نعت کو فنی حیثیت سے برتا۔ ان کے تمام قصائد حمدیہ اور نعتیہ ہیں۔ یعنی خدا اور اس کے رسول کی مدح پر مشتمل ہیں۔ انشاء و مصحفی کے اسکول نے بھی نعت کے فن کو بڑھاوا دیا۔ البتہ اس فن کو معراج تک پہنچانے والے مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی، غلام امام شہید، لطف علی خاں لطف، مولانا قاسم نانوتوی، شہیدی بریلوی، امیر الدین آزاد، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی حالی، شبلی، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا حسن رضا خاں حسن عزیز لکھنوی، اکبر الہ آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، بیدم شاہ وارثی، علی احمد خاں اسیر بدایونی وغیرہ ہیں۔ ان حضرات کی نعتیہ مساعی نعت کے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

حالی و اقبال سے پہلے اُردو نعت نے آنحضورؐ کی سیرت پاک پر کم اور صورت و عقیدت پر نسبتاً زیادہ توجہ مرکوز رکھی جس کے سبب آنحضورؐ کا سراپا اور حضورؐ کے

سے عقیدت تو سامنے آئی لیکن آپ کی ہمہ گیر شخصیت کے وہ پہلو جو عرفانِ ذات، عرفانِ کائنات اور عرفان خداوندی کا ذریعہ ہیں دروں پردہ ہی رہے۔ حالی، اقبال ظفر علیخاں اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ نے اپنی مساعی سے نعت میں جدیدیت کے باب کھولے۔ آپؐ کے بے پناہ اخلاق و کردار کو شعری جامہ پہنا کر پیش کیا جس کا اثر ہم عصروں اور آنے والی نسلوں نے سلیقے سے قبول کیا۔ حافظ پیلی بھیتی اقبال سہیل، دلورام کوثری، شیو پرشاد وہبی، بہزاد لکھنوی، عرش ملسیانی، لطف بدایونی ضیاء القادری، شفیق جونپوری، آسی غازیپوری، حفیظ جالندھری، حمید صدیقی، ماہر القادری، عامر عثمانی کی نعتیہ شاعری نعت کے اس جدید تصور کا بڑی حد تک صحیح معیار متعین کرتی نظر آتی ہے۔

پچھلے چند برسوں سے پاکستان میں نعت گوئی پر خاص توجہ دی جا رہی ہے وہ پختہ کار اور کہنہ مشق شعراء اس طرف متوجہ ہوئے ہیں جن کی راہ ہی جدا ہے اور جنھوں نے اس پر طبع آزمائی کرنے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میری مراد عبدالعزیز خالد اور احمد ندیم قاسمی سے ہے۔ حمد و نعت کی مروجہ ہیئت میں نعیم صدیقی، مظفر وارثی، اور تحسین فراقی، سب ہی طبیعت کی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ نوعمر اور نومشق شعراء بھی اس ضمن میں ان کے ہمرکاب ہیں۔ بہرکیف پاکستان میں نعت کا مستقبل روشن ہے۔

باب دوم

شعر و نعت کی شرعی حیثیت

پہلے باب میں راقم الحروف نے نعت کے ارتقائی سفر اور اسکی جامعیت کا سرسری جائزہ لیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شعر و نعت کی شرعی حیثیت کا تعین بھی کر دیا جائے۔

نعت کا تعلق کلیتہً پیغمبر اسلام کی صفات و کمالات، فضائل و مراتب سے ہے جن کے اظہار کے لئے شعر ایک پسندیدہ اسلوب سمجھا گیا ہے لیکن اسلام میں شعر اور شعر گوئی کا کیا مقام ہے؟ اس پر روشنی ڈالنا ازبس ضروری ہے

اسلام نے شاعری کو 'مقصود و مطلوب' کا درجہ نہیں دیا۔ بلکہ ضرورتاً محض جواز اور بعض حالات میں اباحت و استحباب کے درجہ میں رکھا ہے۔ ان درجات کا مدار احساسات و خیالات کے حُسن و قبح پر ہے جو شعر میں پیش کئے جاتے ہیں جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد سے واضح ہے کہ "شعر بھی کلام کی طرح ہے جو اس میں سے بہتر ہے بہتر ہے، جو بدتر ہے بدتر گفتگو کی طرح ہے" (الادب المفرد۔ امام بخاری) حتیٰ کہ ہجو و ہزل بھی اگر کسی افادیت کے پیش نظر کہی جائے تو وہ بھی جواز کے زمرے میں آئے گی لیکن اگر اشعار کا مضمون اسلام کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو کر محض خرافات پر مبنی ہو تو ایسے اشعار اسلامی نقطۂ نظر سے سخت ناپسندیدہ اور مذموم قرار پائیں گے جن سے اجتناب ضروری ہے۔

ایسے ہی اشعار کے متعلق فرمایا گیا:

کسی کے پیٹ میں پیپ بھرا ہوا ور وہ اسے دیکھ بھی رہا ہو تو یہ بات اس سے اچھی ہے کہ شعر بھرے ہوں (الادب المفرد)

ایسے اشعار کہنے والوں کی اِسلام ہمت افزائی نہیں کرتا۔ قرآن عزیز ایسے شعراء کو تخیلات فاسدہ اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکنے والا کہہ کر ان کی مذمت کرتا ہے۔

قرآن پاک کے پہلے مخاطب اہل عرب تھے اور شاعری اہل عرب کا مزاج تھی۔ شعراء کی زبان سے جو لفظ بھی ادا ہوتا تھا اسے قبولیت عام کی سند حاصل ہوتی تھی یہ گرم گرم اشعار لوگوں کی زبان زد ہو جاتے تھے اور گلی کوچوں میں انھیں لوگ گاتے پھرتے تھے۔ عورتیں ان با مزہ اور نمکین اشعار کو ذوق و شوق سے سُنتیں یاد کرتیں اور دف بجا بجا کر گاتی تھیں۔ شعراء اس فن میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ تمام شاعری لہو و لعب، رندی و سرمستی، تلذذ جنسی، ہجو و ہزل، عشق و حسن، فخر و مباہات اور نفرت و انتقام کے مضامین کی نذر ہو گئی تھی۔ وہ روزمرہ کے ہر سنجیدہ و غیر سنجیدہ جذبہ اور سادہ ضروریات کا اظہار بھی شاعری کے ذریعہ کرتے تھے ان کے متعلقین و متاثرین عادات و خصائل میں ان کے ہم نوا بن گئے تھے۔ اور یہ شعراء اور ان کے متعلقین کا طائفہ ایک بے معنی و بے مقصد زندگی گذار رہا تھا۔ ان شعراء کی زندگی ترتیب و تہذیب اور سچائی و خدا ترسی سے یکسر عاری تھی۔ ان کے قول و فعل میں زبردست تضاد ہوتا تھا۔ ابھی قصیدہ کہا ابھی ہجو۔ یہ نفس اور خواہشات کے بندے تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد تھے۔ اور نئے نئے مضامین پیش کرنے

کی دُھن میں ہر لغو خیال کو نظم کرنا۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دینا انکا کمال سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی کسی کیلئے مثالی (IDEAL) کیا ہو سکتی ہے۔ قرآن نے ایسے شعراء کی مذمت کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (پ ۱۹ سورۃ شعراء رکوع ۱۵ آیت ۲۲۴-۲۲۶) رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ اب رہے ایسے اشعار جو پاکیزگیٔ نفس و ذہن کے ساتھ کہے گئے ہوں حتیٰ کہ وہ اشعار بھی جو نعت و منقبت پر مشتمل ہوں اسلامی احکام میں اباحت اور استحباب کے درجہ میں آتے ہیں۔ انھیں پسند تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے اشعار کہنے والوں کی کوئی خاص مدح سرائی نہیں کی گئی۔ بہر حال اسلام شعر گوئی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہوئے انسانی معاشرے میں اسے صرف اتنا ہی مقام دیتا ہے جتنا وہ فی ذاتہٖ معاشرے کے لئے افادیت کا درجہ رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ اسلام شاعری کی نہ تو تکفیر ہی کرتا ہے اور نہ اس کی اس حد تک رغبت دلاتا ہے کہ آدمی سب کچھ چھوڑ کر اسی کا ہو کر رہ جائے۔ اسلام افراط و تفریط چھوڑ کر ایک بین بین راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ہماری حس لطیف کی شہ رگ پر نشتر نہیں رکھتا بلکہ اجازت دیتا ہے کہ اگر مقدور ہو تو شعر کہیں اور دل چاہے تو سنیں بھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسّان بن ثابت رضؓ سے شعر کہنے کی فرمائش کی اور خود بھی اُمیہ بن ابی الصلت کے اشعار سُنے۔ حضرت شرید رضؓ بیان کرتے ہیں کہ میں امیہ بن ابی الصلت کے

اشعار آپؐ کو سُنانے لگا اور آپ ہر شعر کے بعد فرماتے ہاں اور۔ یہاں تک کہ میں نے سَو اشعار آپ کو سُنائے" (الادب المفرد۔ امام بخاری)۔

اسلام اسکی بھی اجازت دیتا ہے کہ وقت و محل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شعر گوئی کا مقابلہ کیا جائے۔ ایک مرتبہ بنو تمیم کے شاعر اقرع کی طلب پر حضرت حسّان بن ثابت نے شعر گوئی کے میدان میں اس سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ حضرت حسّان بن ثابتؓ فتحیاب ہوئے اور اقرع مُسلمان ہوا۔ اس مقابلہ کی حضورِ اقدس نے اجازت دی تھی۔

شغلِ شعر و شاعری کے بارے میں اسلام نے جو متذکرہ بالا رخصتیں دی ہیں اس ضمن میں یہ بات پھر ایک بار ذہن نشین کر لی جائے کہ یہ اسی وقت ہے جب کہ یہ شغل بامقصد ہو اور صالح اقدار کا حامل۔ شاعر کے کلام میں اچھائیوں کی ترغیب ہو اور برائیوں پر ترہیب، غرض فضائل ہوں رذائل نہ ہوں، تعمیر ہو، تخریب نہ ہو صالحیت ہو لغویت نہ ہو لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اُردو کے کثیر سرمایۂ شاعری میں بہت کم ذخیرہ ایسا ملے گا جو تلذذ جنسی، رندی و سرمستی، حُسن و عشق کی سطحی اور عامیانہ واردات و معاملات سے عاری ہو، حالی، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر اقبال اور جوہر نے شاعری کو صالحیت تفکر و تعقل اور مقصدیت سے قریب تر کیا تو نقادوں نے ان پر اسلامی شاعر ہونے کا لیبل لگا دیا۔ اس سلسلہ میں بہت سے مبحث سامنے لائے جا چُکے ہیں۔ مجھے یہاں تفصیل میں جانا نہیں تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دُنیا کے تمام مذاہب میں دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہی مطابقت اگر عملی

ہو تو صالحیت اسی سے عبارت ہے۔ صالحیت فکری بھی ہوتی ہے اور آفاقی بھی۔ صالحیت فکری کے اقدار میں اختلاف پایا جانا فطری ہے۔ ان مختلف اقدار میں جو بھی قدر فلسفۂ صالحیت سے تال میل کھاتی ہے وہ اسلامی ہے آفاقی صالحیت سے مُراد وہ قدریں ہیں جن سے ابتدائے آفرینش سے اب تک کسی بھی صاحب عقل و خِرد نے اختلاف نہیں کیا جنھیں ہم آفاقی صداقتیں (UNIVERSAL TRUTHS) کہتے ہیں۔ یہ آفاقی صداقتیں یا آفاقی صالحیت ہر زمان و مکاں میں فطرت انسانی سے یکساں طور پر مطابقت رکھنے اور تواتر کے ساتھ اس سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے یقیناً اسلامی ہے۔ گو یہ قرآن و سنّت میں صریحاً نہ ملے (یہ دوسری بات ہے کہ بارگاہ الٰہی میں اسکی اجابت اسی وقت متوقع ہوگی جب اس صالحیت کا قبول اور اُس پر تعمل خدائے برتر کی وحدانیت اور اسکے رسُول کی رسالت کو تسلیم کرکے خالصتہً للہ اور سُنّتِ رسُولؐ کے عین مُطابق ہو سے) پس ان فکری اور آفاقی اقدار کو کوئی شاعر اسلام کے حوالہ سے نظم کرتا ہے تو یہ اسلامی شاعری ہے اور اگر شاعر ایسا اندازِ بیان اختیار کرتا ہے کہ جس سے (بین طور پر یا مرموز انداز میں) ظاہر ہو کہ وہ اسلامی اقدارِ صالحیت کی ترجمانی یا ان کی ترسیل کر رہا ہے تو وہ اسلامی شاعر ہے۔ اب رہے وہ اعمال و معتقدات جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مدرسۂ فکر میں پائے ہی نہیں جاتے تو ان کو نظم کرنے والا شاعر بلا قیود بالا ہی اسلامی شاعر ہے اور ایسی شاعری بدیہی

سے۔ ایسا کیوں؟ یہ ایک الگ بحث ہے جس پر گفتگو کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

طور پر اسلامی شاعری ہے۔

نعت گوئی یقیناً ایک اسلامی شعار ہے اور اسے بجا طور پر اسلامی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے نعت کو بھی بعض لوگوں نے عقیدت کی جگہ عقیدے کا مظہر بنا لیا ہے۔ جبکہ نعت میں فضائل و کمالات نبوی کا ہی بیان ہونا چاہیئے۔ اور وہ بھی شاعرانہ غلو سے دامن بچاتے ہوئے۔ آنحضورؐ سے محبت یقیناً ہمارا جزو ایمان ہے۔ آپ کی ذاتِ مقدسہ ہمارے لئے سرمایہ افتخار، وسیلۂ حیات اور ذریعہ نجات ہے۔ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر تمام کمالات و فضائل آخری حدود امکانی پر جاکر ختم ہوگئے۔ مگر غلو پسند شعراء نے فضائل و کمالات کی اس سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے بڑھ کر بشریت کے ڈانڈے الوہیت سے ملا دیئے اور یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح انھوں نے وارفتگیٔ عقیدت میں اسلام کی اساس توحید پر ہی تیشہ چلا دیا ہے۔ غلو کو اسی پر منتج ہونا تھا اور ہوا۔ ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ غلو پسند شعراء نے جوشِ عقیدت میں نبوت اور الوہیت کے درمیانی فاصلوں کو کس طرح کالعدم کر دیا ہے۔

محمدؐ نے خدائی کی، خدا نے مصطفائی کی
کوئی سمجھے تو کیا سمجھے، کوئی جانے تو کیا جانے

•

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

•

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے، لے لیں گے محمدؐ سے

خُدا نہیں ہیں مگر نائب خدا ہو کر
خُدائی کرتے ہیں بیٹھے ہوئے مدینے میں

ہے بیتاب جس کے لئے عرشِ اعظم
وہ اس رہرو لامکاں کی گلی ہے

ان اشعار کو دیکھئے اور جس ذاتِ مقدسہ کی شان میں یہ اشعار کہے گئے ہیں اسکی واضح ہدایات بھی ملاحظہ فرمایئے لیکن پہلے اس بارے میں ربِ عظیم کا فرمان دیکھئے کیونکہ اسے اوّلیت حاصل ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

یَا اَیُّهَا الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِی دِیْنِکُمْ۔ اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو مت کرو

رسُول کریمؐ کی واضح ہدایات یہ ہیں:

۱۔ ایاکم والغلو۔ فانما اهلك من کان قبلکم الغلوا۔ — خبردار! غُلو سے بچے رہنا۔ تم سے پہلے بہت سوں کو غُلو نے برباد کیا۔

۲۔ أنی لا أرید أن ترفعونی فوق نزلتی التی انزلنیها الله تعالیٰ۔ أنا محمد بن عبد الله عبدهٗ ورسولہ — بے شک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ تم مجھکو زیادہ اس مرتبہ سے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے۔ میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبد اللہ کا۔ اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ۔

یہ احتیاط دیکھیے جسکی تعلیم حضورؐ دے رہے ہیں اور شعراء کی یہ جسارت بھی ملاحظہ فرمایئے جو مذکورہ بالا اشعار کی بے دھڑک خالق بنی غور فرمایئے کہ کیا حضورؐ نے یہ الفاظ محض یوں ہی تواضعاً ارشاد فرما دیئے ہیں کہ جس طرح ایک شاعر اپنی تعریف کرنے والوں سے من آنم کہ من دانم کہہ کر اپنی کسر نفسی کا اظہار کرتا ہے مگر چاہتا یہی ہے کہ مجھے آسمان پر بٹھا دیا جائے۔ نہیں! ہرگز نہیں حضور اقدسؐ کے متعلق تو ایسا تصور بھی گناہِ عظیم ہے۔ اگر ہم حضورؐ کی ان ہدایتوں پر غور کریں تو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگے گی کہ حضورؐ کے ارشادات عالیہ پوری عالم انسانیت کے لیے اصول کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ غلو ایک ایسا نقاب ہے جو ممدوح کے اصل خدوخال کو بدل کر رکھدیتا ہے اور پھر ایک مفسدہ کے بعد دوسرا مفسدہ پیدا ہوتا ہے جو خود ممدوح اور اسکے کاز (cause) کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس نفسیاتی حکمت سے قطع نظر اگر دینی نقطۂ نظر سے ان ارشادات عالیہ کی غرض و غایت پر گہری نظر ڈالی جائے تو دو، دو چار کی طرح واضح ہوگا کہ یہ سنہرے اصول شرک آمیز عقیدت کی جڑ کاٹ پھینکتے ہیں۔ متذکرہ بالا احادیث سے یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ حضورؐ نے اپنی اُمت کو گمراہی اور ضلالت کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کیلئے ان تمام چور دروازوں کی نشاندہی کر دی ہے کہ جن سے شیطان گمراہ کن افکار اور فاسد و کاسد خیالات انسان کے ذہن میں داخل کرتا ہے

اس طول طویل گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ آنحضورؐ کی عظمت و تقدیس میں اس قدر غلو نہ کیا جائے کہ مقام الوہیت تک بات پہنچ جائے۔ یہ دنیوی

عشق و محبت کے افسانے نہیں، جہاں محب، محبوب کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر کہتا ہے ع

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

یہاں خدا کی خلاقیت و ربانیت، قہاری و جباری، حاکمیت اور اسکے بے نہایت عظمت و کبریائی پر ایمانِ کامل کے پیشِ نظر ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت، بشریت اور نبوت کی عظمتوں کو سمجھنا ہوگا۔ بعثت انبیاء سے باری تعالیٰ کا مقصد وحدانیت کی تبلیغ تھا اور اپنے احکام کی بندوں تک ترسیل۔ چنانچہ باہمہ عظمت و وقار انبیاء و رُسل اس کے مبلغ و مُرسل تھے۔ لہٰذا اُلوہیت و نبوت کی حدود کو سمجھنا شعراء کے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ نعت کے باب میں ذرا سی لغزش بھی سالہا سال کی عبادت و ریاضت زہد و تقویٰ، عمل و جہد کو کالعدم کر کے قعرِ مذلت میں گرا دے گی قطع نظر اس کے کہ یہ لغزش 'افراط' کی ہو یا 'تفریط' کی۔ لہٰذا شعراء حضرات نعت کو محض شاعری ہی نہ سمجھیں بلکہ یہ ایک مستحب عبادت بھی ہے اور یہ عبادت یقیناً ان قیود کے ساتھ کیجائیگی جو شریعتِ محمدی نے متعین کر دی ہیں۔ بلاشبہ نعت کی تیکنک اور طرزِ اظہار و بیان وغیرہ کا تعین علمائے عروض ہی کریں گے لیکن اس میں جو مضامین نظم کئے جائیں گے ان کی صحت شریعتِ محمدی ہی کرے گی۔ لہٰذا ہر شاعر بطور تبرک نعت کے میدان میں اپنی کج فکری کے گھوڑے نہ دوڑائے بلکہ وہی اس صنفِ نظم میں طبع آزمائی کرے جسے دینِ اسلام کا صحیح فہم ہو اور جو اسلام کی صحیح روح سے آشنا ہو۔

باب سوم

نعت نبیؐ کے غیر مشروع موضوعات

پچھلے دو ابواب میں راقم الحروف نے فنِ نعت کی ادبی، تاریخی اور شرعی حیثیت پر اظہار خیال کیا تھا۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نعت کے موضوعات پر روشنی ڈالی جائے۔

ہر وہ موضوع جو بالتحقیق شریعت محمدی کے خلاف ہے غیر مشروع ہے۔ اس اصول کے تحت نعت کے مروجہ موضوعات میں سے بیشتر کے غیر مشروع ہونے کا سبب شعراء کی جامد تقلیدی ذہنیت اور شعری جذباتیت ہے ذیل میں ایسے تمام غیر مشروع موضوعات کا جو شرعی محاسبہ کیا جا رہا ہے اس میں متذکرہ بالا عوامل کارفرما نظر آئیں گے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق غیر مشروع موضوعات یہ ہیں۔

(۱) آنحضورؐ کا مختارِ کُل ہونا (۲) قاب قوسین کا تصوّر (۳) حضورؐ کی محبوبیت (۴) آنحضورؐ کا علمِ غیب۔ (۵) آنحضورؐ کا نور من نور اللہ اور نور ہونا۔ (۶) آنحضورؐ کے سایۂ مبارک کا نہ ہونا (۷) حضورؐ کا سبب تخلیق کائنات ہونا (۸) عرش اعظم کا تصوّر (۹) میم کا پردہ (۱۰) حضورؐ کا تقابل دیگر انبیاء کیساتھ (۱۱) جبریل امین کو حضور کے درکا دربان کہنا ان موضوعات کا بالترتیب شرعی تحقیقی جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ آنحضورؐ کا مختارِ کُل ہونا۔

کیوں نہ ہو عالم پہ احساں احمد مختار کا
ہے وہ مالک خالق کونین کی سرکار کا

(بہادر شاہ ظفر)

- مختار کارخانۂ قدرت ہیں مصطفےٰؐ
ہے ان کو اختیار سپید و سیاہ کا (بیخود دہلوی)

- اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے (غالباً مضطر خیرآبادی)

- بے اس کے حکم کے نہ چلے لوح پر قلم
مالک ہے وہ تمام سپید و سیاہ کا (غلام امام شہیدؔ)

- بغیر از لکھے اور کئے بے رقم
چلے حکم پر اس کے لوح و قلم (میر حسنؔ)

- ہے ملکِ خدا پہ جس کا قبضہ
میرا ہے وہ کامگار آقا (مولانا احمد رضاؒ)

- محبوب و محب کی مِلک ہے ایک
کونین ہیں مال مصطفائی (ایضاً)

- عرش تا فرش ہے جس کے زیرِ نگیں
اس کی قاہر ریاست پہ لاکھوں سلام (ایضاً)

یہ ایک غلط خیال نعت میں جگہ پا گیا ہے کہ آنحضورؐ 'مختارِ کُل' ہیں (مختارِ کُل بمعنٰی

ہر چیز پر مکمل اختیار رکھنے والا گویا کوئی چیز اس کے اختیار سے باہر نہیں) آپ جسے جو چاہیں دیں جس سے جو چاہیں لے لیں۔ تمام کائنات حضورؐ کے تحتِ اختیار کر دی گئی۔ جبکہ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ہی ربُّ العالمین ہے۔ مالک و مختار ہے۔ اسکے فیصلے اور حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف چند آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ درج کر رہا ہوں جو وضاحتہً حضورؐ کے بعض معاملات میں اختیارات کلی حاصل ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ ملحوظ خاطر رہے کہ ایک معاملے میں بھی عدم اختیار مختار کُل، کے مفہوم کو ختم کر دیتا ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۝
(پ ۴ آل عمران ع ۱۳۔ آیت ۱۲۸)

آپؐ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائے یا ان کو کوئی سزا دے کیونکہ وہ بھی ظلم بڑا کر رہے ہیں۔

صحیح بخاری جلد ۲ (ص ۵۸۲) میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام کے لئے جو آپ کو تکالیف پہنچانے میں پیش پیش تھے بد دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت نازل فرمائی اور نمع طور پر ارشاد فرمایا کہ اس معاملے میں آپ کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ہم چاہیں تو انھیں توبہ کی توفیق دیں یا سزا دیں۔ چنانچہ یہ تینوں حضرات بعد میں مسلمان ہو گئے اس سے آنحضورؐ کے اختیار کلی کی نفی ہوتی ہے۔ یعنی اللہ کی مصلحت نبی حرف آخر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ
(پ ۲۸۔ التحریم ع ۱۸ آیت ۱)

اے نبی جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے۔

اختصاراً اس آیت مبارکہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ آنحضورؐ نے ام المومنین حضرت زینبؓ کے یہاں شہد نوش فرمایا تھا۔ بعض ازواج مطہرات نے عرض کیا کہ حضورؐ کے دہن مبارک سے مغافیر (ایک قسم کا گوند) کی بو آرہی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ شہد کو میں اپنے اوپر حرام کرتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا الفاظ کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا اور واضح طور پر فرمایا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اسے آپ حرام کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ (الکھف آیت ۲۳)

اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا اِلّا یہ کہ اللہ چاہے

یہ آیت بھی حضور کے اختیارِ کلی کی نفی کرتی ہے۔

یہ اہل سنّت والجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ آنحضورؐ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے اذن سے عاصیان امت کی شفاعت فرمائیں گے جس پر سورۂ بقر کی یہ آیت دال ہے

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (پ البقرہ ع ۱ آیت ۲۵۵)

کون ہے جو اسکی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔

یہ اُذن، واضح کر رہا ہے کہ حضورؐ کو اپنی اُمت کے کسی فرد کو اپنے اختیار سے جنّت میں داخل کرنے بلکہ مالک یوم الدین کی اجازت کے بغیر اس کی مغفرت کیلئے شفاعت کرنے کا بھی اختیار حاصل نہیں۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جنّت حضورؐ کی ملکیت نہیں کیونکہ صاحب مِلک ہو کر کسی شخص کو اس میں داخل کرانے کے لئے اِذن لینا بے معنی چیز ہے۔ لہٰذا آپ کو مالک جنّت و دوزخ تسلیم کرنا بھی اسلام کے خاص الخاص عقیدۂ شفاعت کے منافی ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث ملاحظہ فرمایئے۔ اپنی اُمت کی شفاعت کے بعد ان لوگوں کی طرف حضورؐ متوجہ ہوں گے جو صرف توحید پر ایمان رکھتے تھے۔ پس آپؐ فرمائیں گے۔

فاقول یارب ائذن لی فیمن قال لَآ اِلٰہَ اِلّا اللہ، قال لیس ذٰلک لک ولکن وعزّتی و جلالی وکبریائی وعظمتی لاخرجن منہا من قال لا الٰہ الا اللہ متفق علیہ (المشکوٰۃ جلد۲ ص۴۸۹)	تو میں کہوں گا کہ اے میرے رب مجھے اجازت دے (ان لوگوں کی سفارش کی) جنھوں نے لَآ اِلٰہَ اِلّا اللہ پڑھا ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ کام آپ کے اختیار کا نہیں ہے لیکن مجھے اپنی عزت، جلال بڑائی اور عظمت کی قسم ہے میں (جہنم سے ضرور ایسے لوگوں کو نکالوں گا جنھوں نے لَآ اِلٰہَ اِلّا اللہ کہا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں مُلّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلّا اللہ کہنے والوں کا دوزخ سے نکالنا آپ کو تفویض نہیں کیا گیا اور نہ یہ آپ کے اختیار میں ہے اگرچہ آپ کو شفاعت کا حق ہے (مشکوٰۃ جلد۲ ص۴۸۹)

دوسری حدیث ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ آپ اپنے امتی سے کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا اُمتی ہے جو آپؐ سے روزِ حشر عذابِ الٰہی سے چھٹکارا پانے کے لئے مدد کا خواہاں ہوگا۔ حدیث کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

یارسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیئًا قد ابلغتک۔ (بخاری جلد۲ ص۴۳۲)	اے اللہ کے رسول میری مدد کیجئے اور میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں تجھے تبلیغ کر چکا تھا۔

يا فاطمة سليني ما شئتِ من مالي لا اغني عنكِ من الله شيئا (بخاری جلد ۲ ص ۷۰۲)

(اے میری لخت جگر بیٹی) فاطمہ جس مال کا میں مالک ہوں اس میں سے جتنا تو چاہے مجھ سے مانگ لے مگر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تیرے کسی کام نہ آؤں گا۔

ان احادیث[1] سے آپ کے اختیار کُلی کی نفی ہوتی ہے۔ غرض یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ آپ مختار کُل نہیں جنّت دوزخ، لوح و قلم، بحر و بر غرض دنیا و ماورئی سب اللہ ہی کے اختیارات اور اسکی مشیّت کے تحت قائم ہیں۔ پس حضورؐ کو جنّت و دوزخ بلکہ تمام کائنات یہاں تک کہ یوم آخر کا مالک و مختار کہنا حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ اس خیال کا اظہار کہ لوح و قلم آپ کے زیر نگیں ہیں، گویا قلم آپ کے حکم سے لوح پر رواں ہوا یہ بھی حقیقت سے دور کی بات ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیر آسمان و زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل لکھدی تھی۔ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے کہ لوح پر قلم اللہ کے حکم سے ہی چلا تھا۔

كتب الله مقادير الخلائق قبل ان تخلق السمٰوٰت والارض خمسين الف سنة (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۹ مسلم جلد ۲ ص ۳۳۵)

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیر کو آسمان اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل لکھدیا تھا۔

---

[1] ان احادیث صحیحہ کے ساتھ یہ حدیث بھی ملاحظہ فرمائیں جو "ملفوظاتِ اعلیٰ حضرتؒ" میں بیان کی گئی ہے (روزِ حشر حضور اقدسؐ نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا) اے رب کریم میری اُمّت کا حساب مجھے دیدے (ارشاد ہوا) اے محمد تیری اُمّت میرے بندے ہیں خود ہی حساب لوں گا (الملفوظات جلد ۳ ص ۲۸۰) یہ حدیث بھی میرے مدعا پر شاہد ہے۔

پس مذکور بالا مفہوم لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مختار کل نظم کرنا یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ آپ واقعۃً اور حقیقۃً مختار کل نہیں تھے۔ جیسا کہ اس تحریر سے ثابت ہوا۔ لیکن لفظ مختار کے معنی برگزیدہ، چُنا ہوا، پسند کیا ہوا بھی ہیں اس لئے ان معنیٰ میں اگر حضورؐ کو مختار (نہ کہ مختار کل) نظم کیا جائے تو لاریب صحیح ہے۔

(۲) قابَ قوسین کا تصوّر

سایۂ کردگار بے سایہ
جسکا قوسین ادنیٰ اک پایہ
(شاہ حسین حقیقت)

مقرب ذاتِ حق کے رازداں اسرار قدرت کے
مقام قاب قوسین آشنا تشریف لے گئے
(ناطق گلاؤٹھی)

اُتر آئے خود عرش وکرسی سے جلوے
نبوت کا اوج کمال اللہ ــــ اللہ
(عرش ملسیانی)

شعراء 'قاب قوسین' کا مضمون بھی اپنی نعتوں میں نظم کرتے ہیں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ قاب قوسین کا صحیح مفہوم بھی یہاں بیان کر دیا جائے۔

یہ سب ہی جانتے ہیں کہ 'قاب قوسین' سے مراد دو کمانوں کا فاصلہ ہے۔ یہ الفاظ سورہ نجم میں وارد ہوئے ہیں۔ سورۂ نجم کی متعلقہ آیات یہ ہیں۔

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝ ذُوْمِرَّةٍ
فَاسْتَوٰی وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ
اَوْ اَدْنٰی ۝ (پ ۲۷ النجم ع ۴ - آیت ۵ - ۹)

انکو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقتور ہے پھر وہ فرشتہ (اپنی اصلی صورت پر نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ وہ (آسمان) کے بلند کنارے پر تھا پھر وہ فرشتہ (آپؐ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا اور اس سے بھی کم

ان آیاتِ قرآنی میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اسطرف مشیر ہے کہ 'قاب قوسین' یعنی دو کمانوں کا فاصلہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ آپؐ کو اقصائے فلک پر اپنی اصل شکل و صورت میں کرسی پر بیٹھے نظر آئے تھے اور جیسا کہ اِن آیات میں کہا گیا ہے وہ بتدریج نیچے ہوتے گئے یہاں تک کہ حضورؐ سے دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اکثر مفسرین کرام نے جن میں متقدمین و متاخرین بھی شامل ہیں 'قاب قوسین' کو حضرت جبرئیلؑ اور حضور اقدسؐ کے درمیان کا فاصلہ کہا ہے جیسا کہ مولوی نعیم الدین مرادآبادی نے فاضلِ بریلوی مولانا احمد رضا خاںؒ کے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے البتہ بعض مفسرین نے اس فاصلے کو حضورؐ اور اللہ تعالےٰ کے درمیان تصور کیا ہے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ فاصلہ ان دو ہستیوں کے درمیان ہوا کرتا ہے جو اپنی الگ الگ حدود رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ مکان و زماں اور جہت سے پاک و منزہ ہے۔ وہ محیط ہے اور کوئی حد و د نہیں رکھتا۔ پس اللہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصلہ کی حد بندی ممکن نہیں۔ البتہ وہ علماء جو اسطرف گئے ہیں کہ شبِ معراج حضورؐ اقدسؐ اللہ تعالیٰ کے اس قدر قریب ہوئے کہ صرف دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا انھوں نے اس فاصلہ کی تاویل کی ہے وہ یہ کہ قاب قوسین کنایہ ہے 'تقربِ الٰہی' اور خدا اور رسول کے درمیان محبت و دوستی سے جیسا کہ آیت کریمہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (پ ۲۶ سورۃ ق) میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کا رگ جاں سے قرب، کنایہ ہے اس کے کمالِ علم یا علم محیط سے۔ اہل عرب میں قاب قوسین کی اصطلاح قرب و محبت اور دوستی کیلئے کنایۃً

مستعمل تھی۔ چنانچہ جب دو اشخاص اپنی آپس کی محبت اور قربت کا عہد اور اس کا اظہار کرتے تھے تو وہ دونوں اپنی کمانوں کو ایک دوسری سے ملا کر تیر چھوڑتے تھے اور یہ کمانوں کا قرب علامت ہوتی تھی اس عہد کی کہ آج سے ان میں سے ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن اور ایک کا دوست وحلیف دوسرے کا دوست وحلیف ہوگا۔ پس ان علماء کے نزدیک 'قاب قوسین' کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس کو اپنا محبوب وخلیل بنایا اور انتہائی قربت سے نوازا اور گویا یہ اعلان کیا کہ اس کے محبوب کا دشمن اس کا دشمن اور اس کے خلیل کا دوست اس کا دوست ہے بے شک اس مفہوم میں یہ اصطلاح 'قاب قوسین' اللہ اور اسکے رسول کے درمیان حقیقی فاصلہ کے ماپ کی طرف مشیر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ حقیقی فاصلہ جسکا ماپ سورہ النجم میں "فکان قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے حضور اقدس اور حضرت جبرئیلؑ کے درمیان تھا اور یہی صحیح تر ہے کیونکہ سورہ النجم کی محولہ بالا آیات کے ظاہر سے مطابقت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت مسروق تابعیؒ کی روایت جو حضرت عائشہؓ سے بخاری شریف میں مروی ہے اسکی زبردست موئید ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "یہ میں ہی تھی کہ جس نے سب سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ یہ فاصلہ قاب قوسین کن کے درمیان کا فاصلہ ہے تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرے اور جبرئیلؑ کے درمیان"

حاصل تحریر یہ کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ جو اللہ اور اس کے رسول کے درمیان منتہائے معراج سمجھا جاتا ہے، علماء سے بالاتفاق متحقق نہیں اسلئے صحیح تر بات

یہی ہے کہ یہ فاصلہ حضورؐ اور جبرئیلؑ کے مابین کا فاصلہ ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے بیان فرمایا ہے بلکہ خود سورۂ النجم کی آیات بھی اسکی مظہر ہیں۔

(۳) آنحضورؐ کی محبوبیت

خدا بھی حسینوں کو رکھتا ہے دوست
محمدؐ سا محبوب، اسکا ہے دوست
نبی پر ہوا حسن کا اختتام
کہ معشوقِ خالق تھے خیر الانام

(بیخود لکھنوی)

کیا معشوق ہو کر اس نے طے عشق
اسی کو عشق ہے اور عشق ہے عشق
وہی تصدیق صادق اور وہی عشق
وہی معشوق، عاشق اور وہی عشق

(نواب محبت خاں محبت)

محمدؐ کا اعزاز اللہ اکبر
خدا اور بندے کے خود ناز اٹھائے

(خمار بارہ بنکوی)

حضورؐ اللہ تعالےٰ کے محبوب تھے۔ آپ کی محبوبیت ایک مسلّمہ امر ہے اور ہر صحیح العقیدہ مسلمان کا جزوِ ایمان اس لئے نعت رسولؐ میں اس کا ذکر مستحسن ہے۔ کیونکہ اس سے حضورؐ کے اُس اعلیٰ ترین مرتبہ کا اظہار

ہوتا ہے جو آپ کو بارگاہِ خداوندی میں حاصل ہے لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ اللہ کے لئے لفظ 'محب' اور حضورِ اقدس کے لئے لفظ 'محبوب' کا مفہوم عوام میں غلط سمجھا جانے لگا ہے۔ عوام ان الفاظ کو دنیوی عشق و محبت پر محمول کرتے ہیں بعض نادان تو اللہ تعالیٰ اور حضورِ اقدس کو واضح طور پر عاشق و معشوق کہہ بیٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو عاشق کہتے ہوئے اُن کے زنگ آلود ذہنوں میں عاشق کا وہی دنیوی تصور ہوتا ہے جو افسانوں، شعروں اور روزمرہ کے مشاہدوں نے ان کے اذہان میں مرتسم کر دیا ہے۔ یعنی محبوب کی ناز برداری عاشق کا حاصل حیات اور معشوق کی خفگی اور ناراضگی عاشق کیلئے سوہانِ روح! اللہ اور اسکے رسول کیلئے اس فاسد تصورِ حبیبیت و محبوبیت نے عجیب عجیب کاسد اعتقادات کو جنم دیا۔ اور ان ناقابل یقین و تسلیم اعتقادات کو نعت گو شعراء نے بے تکلف نظم کرنا شروع کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ شب معراج کو اللہ تعالیٰ نے قد اتخذ تك حبیباً (میں نے آپ کو اپنا محبوب بنایا) کے الفاظ سے آپ کو محبوبیت کا نورانی تاج پہنایا اور قرآن میں جگہ جگہ آپ کا ذکر اس محبت آمیز انداز میں فرمایا کہ جس سے آپ کی محبوبیت ماہ نیم ماہ کی طرح روشن ہو کر سامنے آتی ہے لیکن یہ محبوبیت کیا ہے؟ کیا یہ عشق کی قسم سے کوئی جذباتی چیز ہے؟ —— یہ عبارت ہے تقرب الٰہی سے یعنی اللہ تعالیٰ سے کسی بندے کو جو زیادہ سے زیادہ قرب ممکن ہے وہ آپ کو حاصل تھا اور یہ سب اکرام و توقیر اسی تقرب کی وجہ سے ہے جسے ہم محبوبیت سے تعبیر کرتے ہیں اور واقعتاً یہی وہ محبوبیت ہے جو آپ کے لئے طرۂ امتیاز ہے یہی محبوبیت

جب دنیوی معشوقیت کے معروف تصور کے ساتھ عوام الناس کے ذہنوں میں رچ بس جاتی ہے تو عجیب وغریب امکانات کے دریچے خود بخود کھُل جاتے ہیں اور پھر ہر غیر واقعی بات اسی منطق سے حضورِ اقدسؐ کی ذاتِ عالی صفات پر منطبق کر دی جاتی ہے کہ گویا وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے مثلاً:

(۱) کہا جاتا ہے کہ جب کسی استاد کا ایک شاگرد محبوب بن جاتا ہے تو استاد کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے تمام علوم وکمالات اپنے اس محبوب شاگرد کو دے ڈالے پس اللہ تعالیٰ کیوں نہ چاہے گا کہ وہ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تمام علوم وکمالات تصرفات واختیارات دیدے۔ ایسے ہی منطقی لوگ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں۔

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لیں گے محمدؐ سے

گویا اللہ کے پاس جو کچھ تھا وہ سب اپنے محبوبؐ کو دے دیا۔

(۲) ہر عاشق اپنے معشوق کی رضا چاہتا ہے پس اللہ تعالیٰ بھی اپنے محبوب کی رضا کا جویا رہتا ہے اور ہر معاملہ میں اس کی رضا چاہتا ہے۔

(۳) عاشق ومعشوق کے مابین 'میرا تیرا' نہیں ہوتا۔ پس جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کا ہے وہ اس کے محبوب کا ہے۔ پھر اللہ سے کیوں مانگیں اس کے محبوب ہی سے کیوں نہ مانگیں آخر دونوں جہان آپ کے زیرِ تصرف ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب، محب میں نہیں میرا تیرا

بنظرِ اختصار میں نے صرف تین مثالیں پیش کی ہیں کیونکہ یہی زیادہ تر نظم کی جاتی ہیں

ورنہ حضورؐ کی محبوبیت کو معشوقیت کے معروف عوامی معنیٰ میں لے کر اس پر قیاسات کی ایک فلک بوس عمارت کھڑی کر دی گئی ہے لیکن اگر ذرا بھی حقیقت پسندانہ رجحان سے ان قیاسات پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ قیاسات ایکدم ہوائی ہیں پہلی مثال کو لیجئے۔ اس کاسد و فاسد قیاس سے اللہ اور اسکے رسول یعنی معبود و عبد کی صفات و کمالات اور اختیارات میں مساوات لازم آتی ہے جو مسلمہ طور پر غلط ہے عطائی اور ذاتی کا فرق موہوم اور بے معنیٰ ہے کیونکہ مخلوق کی کسی بھی صفت کا ذاتی ہونا قطعی محال ہے وہ بہر صورت یقیناً عطائی ہی ہوگی۔ دوسری مثال کے تحت جس قیاس آرائی کا ذکر کیا گیا ہے وہ ربِ عظیم کی بے نہایت عظمت و کبریائی اور اسکی صمدیت کے سراسر منافی ہے۔ آیت کریمہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے) کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ حضور جو کچھ بھی چاہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آئے کہ "سر تسلیم خم ہے ....." اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عنایت کریمانہ کا اظہار کیا ہے کہ حضور روز حشر جب مالک یوم الدین کے اذن سے اپنے گنہگار امتیوں کی شفاعت فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے الطاف خسروانہ سے اتنی کثیر تعداد میں گنہگاروں کی مغفرت فرمائے گا کہ حضورؐ راضی ہو جائیں گے یہ اللہ کی طرف سے انعام و اکرام خصوصی ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ مالک و مختار ہے فسبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شئ (پاک ذات ہے وہ کہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے سورہ یٰسین آخری رکوع) وہ مالک یوم الدین ہے اس کے اختیار میں ہے کہ وہ بغیر شفاعت کے محض اپنے علم کی بنیاد پر اپنے بندوں

کی (جن کی چاہے) مغفرت فرما دے۔ آخر اس نے حضورِ اقدسؐ کی شفاعت پر مغفرت کو منحصر کیوں کیا؟ جواب واضح ہے۔ وہ یہ کہ اسکی تمام مخلوق واضح طور پر جان لے کہ حضورِ اقدسؐ کے مراتب کی رفعت کیا ہے۔ یہ انعام نہیں تو کیا ہے۔ روزِ حشر جو انعامات حضورِ اقدسؐ کو عطا کئے جائیں گے (مثلاً مقامِ محمود، وسیلہ وغیرہ) ان انعامات میں ایک انعام یہ بھی ہے کہ حضور کو بطور اکرام شفاعت کا حق دیا اور آپؐ کی شفاعت سے اتنی کثیر تعداد میں گنہگاروں کی مغفرت کیجائیگی کہ آپؐ راضی ہو جائیں گے۔ اس آیت کریمہ کا یہ مطلب لینا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کی رضا کا اس حد تک جوبط اور پابند ہے کہ حضورؐ کی جو بھی رضا ہوگی اللہ تعالیٰ ہر حال میں اسکی پذیرائی فرمائیگا کیونکہ پابندی اس کے اختیارات کے منافی اور جو یا ہونا اس کی شانِ صمدیت کے خلاف ہے۔ وہ اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیشِ نظر حضورؐ کی رضا کے موافق بھی فیصلہ فرماتا ہے اور خلاف بھی۔ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ (الآیت) یعنی وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ دعاؤں کا قبول و عدم قبول بھی اسی کی مشیت پر ہے اور اس میں کوئی استثنےٰ نہیں میرے اس بیان کو حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی اس حدیثِ رسولؐ سے تقویت ملتی ہے جو تجرید بخاری کی کتاب الدعوات میں دیکھی جاسکتی ہے کہ ہر نبی کی ایک دُعا مقبول ہوتی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی دعا محفوظ رکھوں تاکہ قیامت میں اس کے ذریعہ اپنی اُمت کو بخشواؤں یہ حدیث مبحث کا دوٹوک فیصلہ کر رہی ہے کہ اللہ کسی کی رضا کا پابند نہیں۔

حضورؐ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ یا اللہ میری اُمت فتنہ و فساد سے محفوظ رہے (یعنی اس میں پھوٹ نہ پڑے) مگر اللہ تعالیٰ تو ہر بات کی مصلحت کو حدِ کمال

تک جانتا ہے اس نے حضورؐ کی اس بات کو منظور نہیں فرمایا[۱] ابو طالب، حضورؐ کے مشفق چچا کی مثال بھی سامنے ہے حضور کی خواہش اور تمنا تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ اسکی قدرت سے قطعاً بعید نہ تھا کہ انھیں دولتِ ایمان سے مالا مال فرما دیتا مگر یہ اسکی مصلحت یں مشیت کے منافی ہی تو تھا کہ حضورؐ کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی یہاں تک کہ حضورؐ نے انکی مغفرت کی دُعا کرنی چاہی (صحیح بخاری جلد۲ ص۶۷۵ مسلم جلد ا ص۴۰ وغیرہ) مگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے دُعا کرنے سے بھی روک دیا جیسا کہ قرآن کے پارہ گیارہ سورہ توبہ رکوع ۱۴ کی آیت مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ الخ میں ارشاد فرمایا گیا ہے علاوہ ازیں کفار آپ سے ایسا معجزہ چاہتے تھے جو ہر وقت دیکھا جا سکے (من مانے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے) آپؐ کے دل میں بھی غالباً ایسے کسی معجزے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ وہ لوگ اس معجزے کو دیکھ کر ایمان لے آئیں مگر اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں اور حکمتیں اس وقت اسکی متقاضی نہ تھیں کہ ایسا معجزہ ظاہر کیا جائے۔ (کیونکہ یہ آنکھوں کے اندھے اور بدنصیب تو کتنے ہی معجزے دیکھ چکے تھے) پس اللہ تعالیٰ نے کفار کے مطالبہ کو رد فرماتے ہوئے آپؐ سے ارشاد فرمایا فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ (پ انعام ع ۱۴) اگر آپؐ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سُرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لیں پھر کوئی معجزہ لے آئیں تو لے آیئے) یعنی ہم ایسا کوئی معجزہ ظاہر نہیں کریں گے ہاں اگر آپؐ سے ہو سکے تو زمین میں سُرنگ لگا کر یا آسمان تک سیڑھی لگا کر کوئی ایسا معجزہ لے آیئے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی جانب سے صاف انکار۔ اسی ضمن میں مزید دیکھیے۔ 'روزِ حساب' پیش آنے والا یہ معاملہ آپ 'مختار کل' کی بحث میں

[۱] مشارق الانوار ص ۳۱۲

پڑھ ہی چکے ہیں کہ حضورؐ اپنی اُمّت کی شفاعت سے فارغ ہو کر پھر سجدہ ریز ہوں گے تاکہ اللہ کے ان بندوں کی شفاعت بھی فرمائیں جن کا صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر ایمان تھا مگر اللہ تعالیٰ آپ کو شفاعت کا اذن مرحمت نہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمائیگا کہ یہ کام آپ کا نہیں - میں خود ہی ان لوگوں کو جہنم سے نکالوں گا - اور یہ بھی کافی وضاحت کے ساتھ میں مسئلہ 'مختار کل' کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں کہ حضورؐ اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کریں گے کہ اے اللہ میری اُمّت کا حساب مجھے دیدے (یعنی یہ کام مجھے تفویض کر دے تاکہ میں اپنی اُمّت کا حساب خود ہی لے لوں) ارشاد ہوگا کہ اے محمدؐ تیری امت میرے بندے ہیں - میں خود ہی حساب لوں گا۔

یہ تمام شواہد جو قرآن اور مستند احادیث سے پیش کئے گئے ہیں اس مدعا کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اللہ کی مشیت کسی کی رضا کی جو یا یا اسکی پابند نہیں - وہ اپنی مصلحت میں مشیّت اور حکمت کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اب تیسرے قیاس پر غور کیجئے - یہ قیاس بھی عاشق و معشوق کے دنیوی معیار پر قائم کیا گیا ہے - کوئی محبوب اپنے محب کی کوئی بھی چیز اٹھا کر اگر کسی کو دیدے تو عاشق بیچارہ چوں بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ہر حالت میں اپنے محبوب کی رضا کے سامنے سر خم کئے رہتا ہے - وہ اسے کسی بھی حالت میں ناراض نہیں کر سکتا اسی لئے وہ اس کی ناز برداریاں کرتا ہے - کیا اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کے مابین یہی رشتہ محبوبیت ہے؟

یہاں تو یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ محب ہونے کے باوجود صاحب اختیار و مشیّت ہے فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ (پس اسکی ذات پاک ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہر

چیز کی ملکیت ہے سورۂ یٰسین آخری رکوع) تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ (پ ۲۹ پہلی آیت ۔ بابرکت ہے اسکی ذات جسکے ہاتھ میں تمام سلطنت ہے) اس کے کسی حکم و فعل پر چوں وچرا کی گنجائش ہی نہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ ۔ (یعنی اس کے کسی فعل پر اس سے سوال نہیں کیا جاسکتا کہ کیوں کیا۔ کیوں نہیں کیا) وہ جو کچھ عطا فرمائے یہ اسکی مشیت اور انعام نہ دے تو یہ بھی اس کی مشیت اور مصلحت و حکمت غرضکہ اسکی مشیت و مصلحت. اختیار و ارادہ 'محبیت' سے مغلوب نہ 'حبیبیت' سے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال کہ محبوب ہونے کے باوجود ہر امر اور ہر معاملہ میں اپنے محب اللہ تعالیٰ کی رضا کے جویا۔ ہر عطا و کرم پر سجدہ ریز۔ لینا دینا بھی اللہ کی مرضی و حکم کے مطابق چنانچہ ایک مرتبہ مال تقسیم کیا۔ بعض لوگوں نے زیادہ مانگا تو ارشاد فرمایا۔

ما اعطیکم ولا امنعکم انما انا قاسم اضع حیث امرت (مشارق الانوار الباب الخامس ص ۱۳۷ بحوالہ بخاری) یعنی میں تم کو نہیں دیتا اور تم سے نہیں روکتا۔ میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں۔ رکھتا ہوں جہاں مجھ کو حکم ہوتا ہے۔ ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیے ۔ ایک مرتبہ خولہ بنت حکیم نے حضورؐ سے عرض کی کہ اگر طائف فتح ہو تو فلاں عورت کا زیور مجھے دیدیجئے ۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اگر خدا تعالیٰ اس کی اجازت نہ دے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں (اصابہ ج ۸ ص ۷۰)

یہ دونوں روایات (احادیث) اپنے مفہوم میں واضح ہیں کہ حضور کا لینا دینا سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اور اسکی رضا کے تابع تھا آپؐ اپنے معبود حقیقی کی رضا کے متلاشی رہتے تھے۔ اس کی رضا اور اس کی خوشنودی آپؐ کے پیش نظر رہتی تھی۔ چنانچہ جب آپکے صاحبزادے حضرت ابراہیم نے

انتقال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں مگر زبان سے وہی نکلے گا جو پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوگا (مسلم شریف) اس نہج سے آپ محب تھے اور اللہ تعالیٰ محبوب۔

عجیب نورٌ علیٰ نور شان ہے حضورِ اقدسؐ کی کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بھی ہیں اور محب بھی ـــــ محبوب ہیں تو ملاقات کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ براق اور رف رف سواری کے لئے اور سردار الملائکہ حضرت جبریل رہنمائی کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ تمام انبیاء و رُسل کی امامت کا شرف بخشا جاتا ہے۔ تقرب سے نواز کر روبرو کلام کیا جاتا ہے۔ جنت و دوزخ دکھائی جاتی ہے اسرار و عجائبات کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جبیبیت کا ضوفشاں تاج فرقِ اقدس پر رکھا جاتا ہے۔ یوم حشر شفیع بنائے جاتے ہیں اور اس طرح تمام اولین و آخرین میں ممتاز کیا جاتا ہے غرضکہ بے حساب انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے ـــــ محب ہیں تو یہ عالم ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب، اسکی مرضی کے تابع اور اسکی ہر عطا پر اظہار تشکر کے لئے سجدہ ریز۔ اللہ اکبر! یہ ہے شان حضور اکرم کی کہ محبوب بھی عالی شان اور محب بھی عالی شان۔

ان تمام حقائق کو سامنے رکھیئے اور سوچیئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم یعنی محب اور محبوب کو دنیوی محب و محبوب پر قیاس کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کی کی ناز برداریاں کرتا ہے اور ہر معاملہ میں آپؐ کی رضا کا جویا رہتا ہے کس قدر غلط ہے۔ پس حضورؐ کی محبوبیت کو دنیوی جذبات عشق و محبت پر قیاس کر کے نکتہ آفرینیاں کرنا اور ان نکتہ آفرینیوں کو نعتوں میں نظم کرنا درست نہیں۔

(۴) آنحضورؐ کا علمِ غیب۔

مسلط کر دیا تم کو خدا نے اپنے غیبوں پر
نبی مجتبیٰ تم ہو رسولِ مرتضیٰ تم ہو (مصطفےٰ رضا خاں نوری)

سرِ عرش پر ہے تری گذر، دلِ فرش پر ہے تری نظر
ملکوت و ملک میں کوئی شے نہیں وہ جو تجھ پہ عیاں نہیں (مولانا رضا بریلوی)

عالمِ علم دو عالم ہیں حضور
آپ سے کیا عرضِ حاجت کیجئے

(مولانا احمد رضا بریلوی)

خدا نے کیا تجھکو آگاہ سب سے
دو عالم میں جو کچھ خفی و جلی ہے

(رضا بریلوی)

عارفِ ارض و سما میرِ بساطِ کائنات
خیر سے خیر الامم، خیر البشر پیدا ہوئے

(احسان دانش)

اسکی نظر تھی محرمِ اسرارِ دو جہاں
وہ رازدارِ عالمِ غیب و شہود تھا

(راغب مرادآبادی)

ایک یہ خیال بھی شعراء کے ذہن میں سرایت کر گیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت کے تمام اسرار و رموز ہی کے نہیں بلکہ تمام غیوب کے جاننے والے تھے۔ یہ خیال باطل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضورؐ کو حسب ضرورت اللہ تعالیٰ کی جانب سے غیوب پر مطلع کیا جاتا تھا جیسا کہ سورۃ الجن کی اس آیت سے واضح ہے:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (پ ۲۹ سورہ الجن)

غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر جس کو پسند کرتا ہے پیغمبروں میں سے

یہ خیال کہ حضورؐ کو تمام غیوب کا عالم یا تمام غیوب کو از خود جان لینے کی قوت و قدرت عطا فرما کر مبعوث کیا گیا تھا قرآن کی اس آیت کی رو سے درست نہیں:

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (پ ۲۰ النمل ع ۱۔ آیت ۶۵)

ان سے کہو۔ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔

یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ اس آیت کریمہ میں علم غیب کلی محیط اور ذاتی کا انکار کیا گیا ہے، کیونکہ اول الذکر میں اللہ تعالیٰ سے مساوات لازم آتی ہے اور موخر الذکر محال ہے۔ اور محالات کا انکار نہیں کیا جاتا۔ محال اس لئے ہے کہ مخلوق کی ہر چیز مخلوق ہی ہوتی ہے ذاتی نہیں۔ اس آیت کریمہ کے علاوہ بھی متعدد جگہ حضورؐ کے علم غیب کی نفی کی گئی ہے مثلاً:

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ

اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں کثیر فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

ان دونوں آیاتِ کریمہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب دے کر مبعوث نہیں کیا گیا تھا بلکہ جیسا کہ آیتِ اول الذکر سے ظاہر ہے آپ کو غیوب پر حسبِ ضرورت مطلع کیا جاتا تھا۔ اپنے اس خیال کی توثیق میں مندرجہ بالا نصِ قطعی کے علاوہ چند احادیث بھی پیش کرتا ہوں۔ یہ بظاہر متضاد روایات قطعی طور پر یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضور صلعم کو حسب موقع و ضرورت غیوب پر مطلع کیا جاتا تھا۔

(۱) جنگ موتہ کے تمام واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں بیٹھے ہوئے اس طرح ملاحظہ فرما رہے ہیں گویا تمام واقعات آپ کی آنکھوں کے سامنے رو نما ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ اس وقت زیدؓ نے جھنڈا لیا اور وہ شہید ہو گئے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اس وقت حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے) پھر خالد بن ولیدؓ نے جھنڈا لیا اور ان کے ہاتھوں پر جنگ فتح ہوئی (صحیح مسلم جلد ا پارہ ۵، حدیث ۱۱۵۶)

(۲) اب اس کے مقابل 'واقعہ افک' پر نظر ڈالیے، قافلہ کوچ کرتا ہے حضور اقدسؐ قافلہ سالار ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا اونٹ حضورؐ کے ساتھ ہے مگر حضورؐ ان کی غیر موجودگی سے لاعلم ہیں اور جب حضرت صفوان بن معطلؓ حضرت عائشہ رضؓ کو لے کر جو رفع حاجت کی وجہ سے پیچھے تنہا رہ گئی تھیں قافلہ سے جا کر ملتے ہیں تو حضرت عائشہ رضؓ کو ان صحابی کے ساتھ تنہا دیکھکر عبداللہ بن اُبَیّ اور کچھ دیگر منافقین حضرت عائشہ رضؓ کی پاکدامنی پر حرف گیری کرتے ہیں یہاں تک کہ آپؐ

حضرت عائشہ رضؓ کو غالباً علیحدہ کر دینے کے ارادہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مشورہ فرماتے ہیں۔ مزاج شناس رسولؐ حضرت علیؓ عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ کے لیے حضرت عائشہ رضؓ کے علاوہ عورتوں کی کمی نہیں تاہم وہ آپؐ کو تحقیق کا مشورہ دیتے ہیں۔ پس آپ اس واقعہ کی بنفسِ نفیس تحقیق فرماتے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ کو طلب مغفرت کی تلقین فرماتے ہیں کہ اے عائشہ اگر تم نے ایسے کام کا ارادہ کیا ہے تو توبہ کرو۔ جب اللہ سے کوئی بخشش چاہتا ہے تو اللہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اس عرصہ میں آپؐ حضرت عائشہ سے کبیدہ خاطر، ملول اور گریزاں بھی نظر آتے ہیں۔ حضرت سیدہ عائشہ اس صدمے سے روتے روتے مریض بن جاتی ہیں غرض کہ اس واقعہ کی تمام جزئیات فرداً فرداً اس بات کی شاہد ہیں کہ حضورؐ کو اصل بات کا علم نہ تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور نازل فرما کر حقیقت سے مطلع فرمایا۔[1]

پہلی روایت ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں حضورؐ پر دور دراز کے غیوب منکشف ہیں۔ اس کے مقابل دوسری روایت کی رُو سے حضورؐ کو اپنے ہی گرد و نما ہونے والے واقعہ کی اصلیت کا علم نہیں۔ بظاہر ان دونوں روایات میں تضاد ہے لیکن حقیقتاً یہ تضاد نہیں بلکہ وہی بات ہے جو راقم الحروف نے اوپر بیان کی ہے کہ اللہ کی طرف سے حضورؐ کو غیوب پر مطلع کیا جاتا تھا۔ اب ایسے ہی مشتے از خروارے دو بظاہر متضاد روایات اور ملاحظہ فرمایئے۔

(۳) ایک روایت ہے کہ حضورؐ دو قبروں کے پاس سے گزرے اور آپ نے فرمایا کہ ان پر عذاب ہو رہا ہے چنانچہ آپ نے ایک سبز شاخ کو چیر کر دو ٹکڑے کئے اور ہر ایک قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا اور اللہ کے حضور شفاعت کی کہ جب

[1] مسلم جلد ۲ حدیث ۱۰۳۴، بخاری جلد ۲ پارہ ۱۷ حدیث ۱۲۹۰۔ تجرید بخاری کتاب الشہادات حدیث ۱۱۳۱

جب تک یہ شاخ سبز رہے قبر والوں پر عذاب میں تخفیف ہو جائے۔ [1]

(۴) اس کے مقابل دوسری روایت ملاحظہ فرمایئے۔ خیبر کی فتح کے دن زینب بنت الحارث نامی ایک یہودیہ نے آپکی اور آپکے اصحاب کی دعوت کی اور گوشت میں زہر ملا دیا۔ حضورِ اقدسؐ نے لُقمہ منہ میں رکھا جسکا کچھ حِصّہ حلق مبارک میں اُتر گیا اسوقت ایک روایت کے مطابق خود لُقمہ نے بحکم خداوندی آپ کو مطلع کیا کہ آپا مجھے نہ کھائیں۔ میرے اندر زہر ہے (ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۶۴، مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۵۴۳) چنانچہ حضورؐ نے لقمہ اگل دیا اور اعلان کیا کہ اس کھانے کو کوئی نہ کھائے لیکن ایک صحابی حضرت بشر بن براءؓ کھا چکے تھے اس لئے وہ اسی وقت شہید ہو گئے۔ اور حضورؐ بھی زہر کی اذیت رسانی سے محفوظ نہیں رہے کیونکہ آپؐ نے اپنی آخری عمر میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اے عائشہ میں نے خیبر میں جب سے زہر آلود گوشت کھایا ہے اسکی تکلیف برابر محسوس کر رہا ہوں گویا یہ زہر میری رگِ جاں کو کاٹ دے گا (بخاری جلد ۲ ص ۶۳۷)!

یہ دونوں روایتیں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ علم غیب پر آپ کو اللہ کی طرف سے مطلع کیا جاتا تھا۔ ایک طرف تو قبر میں ہونے والے عذاب کو آپؐ کی چشم بینا دیکھ لیتی ہے اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ کھانے میں زہر کی موجودگی کا بھی علم نہیں ہوتا جس کے نتیجہ میں حضرت بشرؓ ایک صحابی شہید ہو جاتے ہیں اور آپؐ خود بھی مدت العمر زہر کی اذیت برداشت کرتے ہیں۔

اب دو ایسی احادیث مزید ملاحظہ فرمایئے جو میرے مدعا (یعنی حضورؐ کو غیوب پر بوقت ضرورت مطلع کیا جاتا تھا) کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور جو اس مسئلہ میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔

---

[1] بخاری جلد اوّل پارہ اوّل حدیث ۲۱۱، مسلم جلد ۱ حدیث ۲۵۰

(۵) کفارہ مکّہ نے یہودی علماء سے مشورہ کے بعد تین سوال حضورِ اقدسؐ کے سامنے پیش کئے اور ان کا جواب مانگا۔ سوال یہ تھے (۱) اگلے زمانہ میں جو نوجوان چلے گئے تھے ان کا واقعہ بیان کرو۔ وہ ایک عجیب واقعہ ہے (۲) اس شخص کا حال بتایئے جس نے تمام زمین کا گشت لگایا تھا اور جو مشرق و مغرب ہو آیا تھا (۳) رُوح کیا ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کل آؤ۔ جواب دونگا لیکن انشاءاللہ کہنا آپ کے ذہنِ مُبارک سے نِکل گیا۔ اس ذہول پر اللہ تعالیٰ نے وحی روک لی۔ پندرہ دن تک وحی نہیں آئی۔ کفار و منافقین آوازے کسنے لگے کہ کل کا وعدہ تھا اور اب تک جواب نہ دے سکے۔ آپ کو دوہری پریشانی تھی۔ ایک تو وحی کے نہ آنے کی اور دوسری کفار و مشرکین کے طعنوں کی۔ پندرہ دن بعد آخر سورۂ کہف نازل ہوئی جس میں ان سوالات کے جوابات ہیں یعنی اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کا حال وغیرہ (تفسیر ابن کثیر پارہ ۱۵۔ سورہ کہف کی تفسیر)۔ سورۂ کہف کی اس شانِ نزول سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کو کفار کے سوالات کے جوابات معلوم نہیں تھے۔

سورۂ کہف کے نازل ہونے پر معلوم ہوئے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان پر مطلع فرمایا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر حضورؐ کو غیب کا علم ہوتا تو دوسرے دن کا وعدہ نہ فرماتے کیونکہ آپ کے علم میں یہ بات ہوتی کہ وحی رُک جائیگی اور پندرہ دن بعد جوابات کا علم ہوسکے گا۔ ایسی صورت میں نہ آپ کو کفار کے طعنے سُننے پڑتے اور نہ کسی قسم کی پریشانی ہوتی۔ بہرکیف یہ روایت واضح ہے اس امر میں کہ حضورؐ کو غیوب پر مطلع فرمایا جاتا تھا۔

(۶) یہ حضرت انسؓ سے مروی روایت ہے جو تجرید بخاری کے باب ۶۰ صفحہ نمبر ۲۴۴

پر دیکھی جا سکتی ہے. حضورؐ سے تین سوال کئے گئے تھے. اوّل یہ کہ قیامت کی علامتوں میں سے پہلی علامت کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ پہلا کھانا کیا ہے جسکو جنتی کھائیں گے اور تیسرا یہ کہ بچے کس وجہ سے کبھی ددھیال اور کبھی ننہیال کے مشابہ ہوتے ہیں تب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اس کا جواب ابھی جبرئیل علیہ السلام نے بتایا ہے. قیامت کی پہلی علامت وہ آگ ہے جو تمام لوگوں کو ہانک کر مشرق سے مغرب کو لے جائیگی، اور پہلا کھانا جسکو جنتی کھائیں گے مچھلی کے جگر کی نوک ہوگی (ایک ٹکڑا جو جگر کے ساتھ متعلق ہوتا ہے) اور بچے کی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ جب مرد کا پانی عورت کے پانی میں غالب آجاتا ہے تو مرد کی مشابہت کا بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو عورت کے مشابہ پیدا ہوتا ہے عبداللہ ابن سلامؓ فوراً بول اُٹھے میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ یہ سوالات حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے ہی حضورؐ سے پوچھے تھے۔

۵۔ آنحضورؐ کا نورٌ من نور اللہ اور نور ہونا:

- اوّل خدا نے نور تمہارا عیاں کیا
  اس نور سے بنایہ زمیں آسماں کیا (شاہ حاتم)
- حقیقت میں کیا رُتبہ آب و خاک
  مجسم ہوا نُورِ یزداں پاک (میر وزیر علی صبا)
- جس نے ٹکڑے کئے ہیں قمر کے وہ ہے
  نورِ وحدت کا ٹکڑا ہمارا نبیؐ (مولانا احمد رضا بریلوی)
- خدا نے عالم امکاں کا جب ظہور کیا
  تو اپنے نور سے پیدا نبی کا نُور کیا (ہمسر لکھنوی)
- نہیں خورشید کو ملتا ترے سائے کا پتا
  کہ بنا نُور ازل سے ہے سراپا تیرا (سرور جہاں آبادی)
- خُدا کا نُور ہے نُورِ پیمبر
  خُدا کی شان ہے شانِ محمدؐ (وتورام کوثری)

(۱)

یوں تو حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ نور بھی ہیں اور بشر بھی جیسا کہ علامہ خفاجی نے نسیم الریاض (جلد ۲) میں تحریر فرمایا ہے کہ "حضورؐ کا بشر ہونا نور ہونے کے منافی نہیں جیسا کہ وہم کیا گیا ہے" جنس اور ذات کے لحاظ سے آپ بشر ہیں۔ بشریت کے تمام مقتضیات، لوازمات اور عوارض کے ساتھ کامل ترین انسان مگر ——

باطن میں آپ نُور ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نُور کے فیض سے آپ کے نُور کو پیدا فرمایا لیکن یہ سمجھنا اور کہنا دُرست نہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے نُور کا حصّہ تھے اور یہ غلط فہمی اس حدیث کا غلط مفہوم اخذ کرنے سے پیدا ہوئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "انا مِن نُورِ اللہ" (میں اللہ کے نور سے ہوں) اگر ان الفاظ کے یہی معنی لئے جائیں جو عام طور سے سمجھے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپؐ اللہ کے نُور کا ایک حصّہ ہیں یا یوں کہئے کہ اللہ کا ایک حصّہ جو ظاہر ہے شرک کا پہلو اپنے اندر رکھتا ہے رہا یہ امر کہ حضورؐ کے نُور کی ماہیت کیا تھی؟ تو اس ضمن میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قرآن اور صحیح احادیث سے اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی البتہ علماء کی ایک جماعت نے اس سے مراد آپ کی رُوح مبارکہ لی ہے جیسا کہ شرح الشفاء (جلد ۱ صـ۱۷ طبع مصر) میں مُلّا علی قاری الحنفی حضورِ اقدس کی ایک حدیث سے ثابت کرتے ہیں۔

فانہ کما قال صلّی اللہ علیہ وسلم اوّل ما خلق اللہ روحی وسائر الارواح انا خلق ببرکۃ روحہٖ ونورِ وجودہٖ

بس بیشک جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میری روح پیدا کی اور باقی تمام ارواح آپ کی روح اور آپ کے وجود کے نور کی برکت سے پیدا ہوئیں۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

قولہ اول ما خلق اللہ نوری وفی روایۃ روحی ومعناھما واحد فان الارواح نورانیۃ ای اول ما خلق اللہ من الارواح روحی

آپ کا ارشاد ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا اور ایک روایت میں ہے کہ میری روح پیدا کی اور دونوں کا مطلب ایک ہی ہے کیوں کہ ارواح نورانی ہی ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ سب ارواح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میری روح پیدا کی۔

(مرقاۃ ج ۱ صـ۱۶۷ طبع ملتان)

علاوہ ازیں علامہ شہاب الدین احمد محمد الخفاجی الحنفی فرماتے ہیں :

ان اللہ خلق روحہ قبل سائر الارواح وخلق علیہا خلعۃ التشریف نبوۃ

بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح مبارک کو تمام ارواح سے پہلے پیدا کیا اور اس کو خلعتِ نبوۃ سے مشرف کیا۔

(نسیم الریاض جلد ۲، صـ۲۰۰)

ان احادیث و شروح سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نورِ محمدی سے روح محمدی الگ ہے۔

(۲)

آنحضورؐ کے نور ہونے کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ اکثر کم پڑھے لکھے شعراء اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ حضور اقدس بشر نہیں بلکہ نور ہیں۔ علامہ خفاجی کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضورؐ کا بشر ہونا حضورؐ کے نور ہونے کے منافی نہیں۔ اس لئے یہ درست نہیں کہ آپؐ کے نور ہونے کے سبب آپؐ کی بشریت کا ہی انکار کر دیا جائے۔ دراصل بشریت کا انکار اس غیر صحت مند نظریہ کا پیدا کردہ ہے کہ بشریت فی نفسہٖ کم تر درجہ کی شئی ہے۔[1]

---

[1] مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی اپنی تفسیر خزائن العرفان میں "مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا" (الآیت) کی تفسیر کے تحت فائدہ نمبر ۵ میں یہ نظریہ وضاحت سے پیش کر کے نتیجہ نکالتے ہیں:

"مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو بشر کہنے میں اس کے فضائل و کمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے اس لئے قرآن پاک میں جا بجا انبیائے کرام کے بشر کہنے والوں کو کافر فرمایا گیا اور درحقیقت انبیاء کی شان میں ایسا لفظ ادب سے دور اور کفار کا دستور ہے" (خزائن العرفان سورہ بقر رکوع ۲ فائدہ ۵)

مولانا نعیم صاحب نے یہ نشان دہی نہیں فرمائی کہ قرآن نے انبیاء کے بشر کہنے والوں کو کس مقام پر کافر کہا ہے؟ ویسے خود انھوں نے انبیاء کے بشر کہنے کو محض "ادب سے دور" قرار دیا ہے۔ کفر نہیں حالانکہ بقول ان کے قرآن بشر کہنے والوں کو کافر فرماتا ہے۔

اور غور کیجئے کہ اگر بشریت کوئی ادنیٰ درجہ کی شئے ہوتی یا اس سے حضور کے فضائل وکمالات کے انکار کا مبہم پہلو بھی نکلتا تو اللہ تعالیٰ نہ تو اپنے محبوبؐ اور دیگر انبیاء ورُسل کی بشریت کا اعلان فرماتا، نہ حضور اقدس ہی اپنی بشریت کا اقرار کرتے اور نہ صحابہ کرام اور بعد کو آنے والے مشاہیر علماء، دانشور اور ائمہ حضور کی بشریت کو تسلیم کرتے ان اعلانات کی تفصیل مُلاحظہ فرمائیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بشریت کی کمتری کا تصوّر سب سے پہلے شیطان لعین کے ذہن میں آیا اور اس کا سد تصور نے ہی اسے آدم کے خاکی پُتلے کو سجدہ کرنے سے باز رکھا تھا۔ قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے سوال کیا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (کس بات نے تجھے جُھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا) شیطان نے جواب دیا۔ اس بات نے کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے (آدم کو) مٹی سے) بشریت کے اسی غلط تصوّر کے پیشِ نظر کفار ہر زمانہ میں اور ہر دور میں اس پر حیرت زدہ نظر آتے ہیں کہ ایک بشر کو جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے نبی بنا کر بھیجا گیا! اس بات کو قرآنِ عزیز اس طرح بیان کرتا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (پ ۱۵ بنی اسرائیل ع ۱۱ آیت ۹۴: ۹۵)	لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے انکو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجدیا؟ ان سے کہو۔ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو ان کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

یہ آئتیں اپنے مفہوم میں واضح ہیں کہ انسانوں کے لئے انسان ہی رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے تاکہ زمین پر بسنے والے انسان اس کی قربت سے کسی قسم کا خوف محسوس نہ کریں۔ علاوہ ازیں اس کے اعمال و افعال کو اپنے لئے بھی ممکن العمل سمجھیں اور یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہم فرشتوں کے اعمال کی تقلید کیوں کر سکتے ہیں۔ ہم انسان تو مختلف فطرت پر پیدا کئے گئے ہیں۔ ان ہی اعذار کے دفیعہ کے لئے تسلی آمیز انداز میں اللہ تعالےٰ اپنے بندوں سے فرماتا ہے کہ :

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (پ ۱۱ التوبہ ع ۱۶ - آیت ۱۲۸) (دیکھو) تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے

ظاہر اور باہر ہے کہ انسان انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے اور اُسی کی بے تکلف سُنتا ہے۔ لہٰذا اس میں دو رائے نہیں ہونی چاہئیں کہ حضور انسان تھے اور مخلوق کی کسی دوسری جنس سے نہیں تھے۔ اس پر تقریباً پوری اُمت کا اجماع ہے کیونکہ آج تک اُمتِ مسلمہ کے کسی بھی معتبر مفکر نے آپ کو غیر از انسان کوئی جنس ہونے کا نظریہ پیش نہیں کیا کیونکہ ایسا نظریہ اسلام کے دانشور افراد کے لئے قابل قبول ہو ہی نہیں سکتا تھا خود قرآن آپ سے اپنے بشر ہونے کے اعلان کا مطالبہ کر رہا ہے اور حضور خود بھی اپنے بشر ہونے کا اعلان فرما رہے ہیں۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (پ ۱۵ بنی اسرائیل ع ۱۰ آیت ۹۳)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار میں تو صرف ایک انسان ہوں جو رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (پ ۱۶ الکہف ع ۳ آیت ۱۱۰)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا۔

اس ضمن میں خود حضور اقدس نے جو کچھ فرمایا وہ بھی آپ کی بشریت کو محکم کرتا ہے

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ - (الحدیث) (بخاری و مسلم ج ۱)	میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں
اَللّٰھُمَّ اِنَّمَا اَنَا محمد بَشَرٌ یَغْضِبُ	اے پروردگار میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بشر ہوں
(الحدیث مسند احمد ج ۲)	مجھے غصہ بھی آجاتا ہے۔
الا یا ایھا الناس انما انا بَشَرٌ یوشک	خبردار! لوگو! میں تو بس ایک بشر ہوں۔ قریب ہے
ان یاتینی رسولُ ربی عزوجل فاجیب	کہ میرے پاس میرے رب عزوجل کا قاصد (ملک الموت)
(الحدیث مسند احمد ج ۴ - مسلم جلد ۲)	آجائے اور میں اسکے حکم کی تعمیل کروں۔

صحابہ کرام بھی حضورؐ کی بشریت کے معاملہ میں متفق تھے۔ مثلاً حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔

اِن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم	کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی
قد مات وانہ بَشَرٌ (الاثر صحابی۔ دارمی)	ہے کیونکہ یقیناً آپ بشر تھے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

کان بشرا من البشر (الاثر صحابی۔ الادب المفرد۔ شمائل ترمذی)۔ (آپ) تھے بشر میں سے ایک بشر۔

حضورؐ کی بشریت کی تفصیل علامہ شہاب الدین احمد الخفاجیؒ نے نسیم الریاض (جلد ۴ ص ۴۶-۲۵) میں مُلّا علی قاریؒ نے شرح شفاء (جلد ۲ ص ۶۲۵) میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کی ہے کہ آپ لوازم بشریت اور طبعی عوارض بشریت کے ساتھ کامل ترین بشر تھے۔ البتہ یہ بات آپ کے خصائص میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصلحتاً کم یہ عوارض سے محفوظ رکھا تھا۔

آپ کو فوق البشر قرار دینا بھی دُرست نہیں۔ دراصل شعراء نے آنحضورؐ اور دیگر انبیاء کرام کے معجزات کو حجت بنا کر آپؐ کو فوق البشر تصور کر لیا۔ معجزات

کا ظہور ان مقدس ہستیوں کے اپنے ارادہ و تصرف سے نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ معجزات اللہ تعالیٰ کیطرف سے عطا کئے جاتے ہیں قُلْ اِنَّمَا الْاٰیات عِنْدَ اللّٰہ (آپ کہہ دیجئے کہ تمام نشانیاں اللہ کیطرف سے ہیں) قرآن کی کتنی ہی آیات اور ائمہ کرام کے ارشادات ہماری اس بات کے موئید نظر آتے ہیں۔ قطع نظر ان سب کے میں زمانۂ حال کے ایک مشہور عالم مدنی میاں ملقب بہ شیخ الاسلام کے ایک خطبہ کا اقتباس پیش کرتا ہوں جسمیں انھوں نے فرمایا: "نبی کا ہر معجزہ خدا کی قدرت ہے۔ ولی کی ہر کرامت خدا کی قدرت ہے لہذا خود نہ ولی اپنی کرامت دکھا سکتا ہے نہ نبی معجزہ دکھا سکتا ہے"

(خطبات برطانیہ ص ۱۹۲)

پس معجزات کی بنیاد پر انبیاء کو فوق البشر قرار دینا صحیح نہیں۔ قطع نظر معجزات کے جو بھی قوتیں اور تصرفات آپ کو عطا کئے گئے وہ مافوق الفطرت نہیں بلکہ وہ فطرت ہی کے عین مطابق ہیں۔ یہ البتہ آپ کے خصائص میں سے ہے کہ آپ کے اندر ہر بشری وصف گزشتہ اور آئندہ تمام مخلوقات سے انتہائی حدود تک زیادہ تھا۔ اِن بشری اوصاف کے علاوہ آپ کو وہ مخصوص مقامات و کمالات بھی عطا فرمائے گئے جو کسی بشر کو نہ ملے جیسے آپ کے پسینہ کا خوشبودار ہونا وغیرہ وغیرہ اور ایسے کمالات و مقامات بھی آپؐ کو مخصوص طور پر عطا فرمائے گئے جن میں آپکا نظیر و مثیل ناممکن ہے جیسے آپؐ کا خاتم الانبیاء ہونا۔ حاصل کلام یہ کہ آپ کو نور نظم کرنا درست تو ہے مگر اس طرح نہیں کہ اس سے آپؐ کی بشریت کا اِنکار لازم آئے یا اس سے یہ تاثر ملے کہ آپؐ کا نور اللہ تعالیٰ کے نور کا ایک حصّہ تھا۔

(۶) آنحضورؐ کے سایۂ مبارک کا نہ ہونا

یہ تھی رمز جو اس کے سایہ نہ تھا
کہ رنگ دوئی واں تک آیا نہ تھا

(میر حسن)

سارا بدن حضورؐ کا جب نُور ہوگیا
پھر دور کیا تھا سایہ اگر دُور ہوگیا

(مجذوب)

دلیل اسکی ہے یکتائی کی یہ لاریب اے جُرأت
کہ تھا سایہ نہ اس محبوب ذاتِ کبریائی کا

(جرأت)

اللہ کا محبوب بھی کم پایہ نہیں ہے
واں جسم نہیں ہے تو یہاں سایہ نہیں ہے

(نامعلوم)

ذاتِ باری کی طرح یکتا ہے ذاتِ مُصطفےٰ
درحقیقت نور تھا سایہ بھی جسمِ پاک کا

(بیخود دہلوی)

گھسے مثل قلم پائے طلب لیکن نہ ہاتھ آیا
نشانِ سایۂ احمد، نشاں تصویرِ احمد کا

(ناسخ)

سایہ کی سیاہی نہ رہے کیوں کر دور
خاتم ہے مگر نور کی یہ خاتم ہے

(مرزا دبیر لکھنوی)

ثانی ترا کونین کے کشور میں نہیں ہے
بس حد ہے کہ سایہ بھی برابر میں نہیں ہے

(اکبر وارثی)

مہرِ کس مُنہ سے جلوہ داریٔ جاناں کرتا
سایہ کے نام سے بیزار ہے یکتائی دوست

(مولانا رضا بریلوی)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کا نہ ہونا ایک ایسا مخصوص موضوع ہے جو اُردو شعراء کا انتہائی پسندیدہ موضوع رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال کہ حضورؐ کا سایہ نہ تھا محض ایک مفروضہ ہے جو غلوئے عقیدت کی پیداوار ہے اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ عربی شاعری میں یہ موضوع کبھی نظم نہیں ہوا، حضرت حسّان بن ثابتؓ کا دیوان بھی عدم سایہ کے ذکر سے خالی ہے بایں وجہ میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع کا بھی علمی جائزہ لے لیا جائے۔

مسئلہ عدم سایہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے نہ صرف شعراء بلکہ بعض علماء بھی

عقیدہ کی حد تک مانتے ہیں۔ بات یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ بعض لاعلم اصحاب اسے ایمان بالرسالت کا لازمی جزو قرار دینے لگے ہیں۔ شعراء کی بات کو غلو کہکر رد کیا جاسکتا ہے لیکن علماء جو دین اسلام کا صحیح فہم رکھنے والے تسلیم کئے جاتے ہیں ان کی بات تو بہرحال عوام کے نزدیک حجت کے درجہ میں ہے اور ان کے لئے علماء کے ارشادات سے اعراض کرنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ کسی شاعر کے نظم کردہ موضوع یا خیال کو رد کر دینا۔

متذکرہ بالا علماء کے نزدیک مسئلہ عدم سایہ بنیادی اور اصولی طور پر مندرجہ ذیل دلائل پر قائم ہے۔

قرآنی آیات

(۱) قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (اے لوگو تحقیق کہ آیا تمہارے پاس نور اور کتاب روشن

(پ۶ سورہ مائدہ ع ۶ آیت ۱۵)

(۲) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

اے نبی ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔ اللہ کی اجازت سے اسکی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ

(پ۲۲ سورہ الاحزاب ع ۲ ایت ۴۵)

احادیث و آثار

(۱) حدیث ذکوان جس میں کہا گیا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ دیکھا جاتا تھا۔

(۲) حدیث رب اجعلنی نورا یعنی اے اللہ مجھے نور بنا دے پس آپ کو نور بنا دیا گیا

چونکہ نور کا لازمہ ہے سایہ نہ ہونا اس لئے آپ کا سایہ نہ تھا۔

(۳) حضرت عثمان غنیؓ سے مروی حدیث (اثر) جس میں کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ نے آپ کا سایہ زمین پر نہ ڈالا تاکہ کسی انسان کا اس پر پاؤں نہ پڑے۔

(۴) حضرت ابن عباسؓ سے مروی حدیث (اثر) جس میں کہا گیا ہے کہ حضور سورج اور چراغ کے سامنے کھڑے ہوتے تھے تو آپ کا سایہ نہ پڑتا تھا کیونکہ آپ کی روشنی سورج اور چراغ کی روشنی پر غالب آجاتی تھی۔ حضرت ابن مبارکؒ اور محدث ابن جوزیؒ نے اسے حضرت ابنؓ عباس سے روایت کیا ہے۔

(۵) ابن سبع کا قول جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ کے خصائص سے یہ بات ہے کہ آپ کا سایہ نہ پڑتا تھا کیونکہ حضورؐ نور تھے۔ اس لئے جب حضورؐ سورج اور چاند کی روشنی میں چلتے تو حضور کا سایہ نظر نہ آتا تھا۔

ان بنیادی دلائل میں کتنا وزن ہے ملاحظہ کیجئے پہلے آیتِ مستدل قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ کو لیجئے اس آیت مبارکہ میں آنحضورؐ کو نور کہا گیا ہے یہاں 'نور' روشنی کے لئے نہیں بلکہ ایمان اور رشد و ہدایت کے لئے آیا ہے جیسا کہ آیت مستدل کے بعد کے الفاظ یھدی بہ اللّٰہ سے خود بخود ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کو نور لغوی معنی میں نہیں بلکہ 'ہادی' کے مفہوم میں کہا گیا ہے لیکن یہ علماء آیت زیر بحث میں لفظ نور کو حقیقی اور لغوی معنی میں لے کر حضورؐ کو نور اور بے سایہ ثابت کرتے ہیں۔ اس نکتہ پر اگر اس نہج سے غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ہر زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔ تمثیل، استعارے، علامتیں تشبیہات، تلازمے و کنایے زبان کا حسن ہوتے ہیں اور یہ ایک مخصوص لسانی

وفکری پس منظر واضح کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ تمام استعارے، کنایے وغیرہ اتنے عام فہم ہو جاتے ہیں کہ ہر عام آدمی انھیں بلا تکلف بولتا اور سمجھتا ہے۔ مثلاً اُردو میں ایک مثل ہے عورت چراغ خانہ ہوتی ہے۔ اکبر کا شعر ہے۔

حامدہ چمکی نہ تھیں انگلش سے جب بیگا نہ تھیں
اب وہ شمع بزم ہیں پہلے چراغ خانہ تھیں

عورت کے صحیح مقام کے اظہار کا ایک خوبصورت اسلوب۔ کیا اس سے کوئی شخص یہ مطلب اخذ کر سکتا ہے کہ عورت سچ مچ ایک چراغ ہے جو اندرون خانہ کارنس پر رکھا ہو عربی زبان بھی زبان کے اِن جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں کم و بیش تیس چالیس جگہ لفظ نُور کا استعمال فرمایا ہے مثلاً

(۱) وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا — یہاں نور سے مراد قرآن ہے

(۲) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْ اَنْزَلْنَا یہاں بھی نور قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے جس سے رشد و ہدایت کی روشنی ملتی ہے غرضکہ قرآن کا یہ معروف انداز بیان ہے اس تمہید کے بعد دیکھئے مفسرین سلف اس آیت مستدل کی کیا وضاحت کرتے ہیں۔ معتبر اور مقبول تفاسیر یہ ہیں۔

(۱) تفسیر روح المعانی (۲) تفسیر کشّاف (۳) تفسیر الجواہر (شیخ طنطاوی)
(۴) تفسیر بیضاوی (۵) تفسیر الجواہر الحسان (ثعلبی) (۶) تفسیر خازن (۷) تفسیر معالم التنزیل
(۸) تفسیر ابن کثیر (۹) تفسیر الکبیر (۱۰) تفسیر المنار (۱۱) تفسیر ابن جریر (۱۲) تفسیر مدارک التنزیل (۱۳) تفسیر المراغی (۱۴) تنویر المقیاس (ابن عباسؓ)

یہ وہ تفاسیر ہیں جو اُمتِ مسلمہ میں بڑی وقیع سمجھی جاتی ہیں ان تفاسیر میں اول

الذکر پانچ تو مطلقاً اس کو تسلیم ہی نہیں کرتیں کہ لفظ نورؐ سے حضور اقدسؐ مُراد ہیں۔ وہ لفظ نور سے قرآن مُراد لیتی ہیں اور اسکی وجہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ چونکہ قرآن شک وگمراہی کی تاریکیاں مٹاتا ہے اس لئے اسے 'نور' کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 'نور' کی شرح میں تفسیر بیضاوی کے الفاظ یہ ہیں۔ "یعنی القرآن فانہ الکاشف لظلمات الشک والضلال" (یعنی قرآن کیونکہ وہ گمراہی اور شک کے اندھیروں کو دُور کرتا ہے) باقی تفاسیر نور سے مُراد گو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی لیتی ہیں مگر واضح طور پر اسے استعارہ کہتی ہیں اور وجہ بھی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ چونکہ آپ کے ذریعہ ہدایت کا نور پھیلا اس لئے آپ کو نور کہا گیا۔ مثال کے طور پر تفسیر خازن کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

نُور یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم انما سماہ نوراً لانہ یھتدی بہٖ کما یھتدی بالنور فی الظلام (نور۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا نام نور محض اس لئے رکھا گیا کہ آپ کے ذریعہ ہدایت پھیلی جیسے کہ تاریکی میں روشنی سے ہدایت حاصل کیجاتی ہے) تمام تفاسیر تقریباً یہی کہتی نظر آتی ہیں۔ غرضکہ کوئی تفسیر بھی یہ نہیں کہتی کہ حضورؐ لغوی معنی میں نورؔ تھے اور اسکا اشارہ تک نہیں کرتی کہ 'نور' ہونے کی وجہ سے آپ کا سایہ نہ تھا۔ اگر متاخرین کی کسی تفسیر سے عدم سایہ کا اثبات تشریح نظر آئے تو قابل غور امر یہ ہوگا کہ اس کا مفسرین سلف اور ائمۂ فن تفسیر کے مقابلہ میں کیا مقام ہے۔

بہر حال ائمہ فن تفسیر قطعاً اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ آیت مستدل میں لفظ نور حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

دوسری آیت مستدل سے پہلے کے الفاظ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (تاکہ نکالے تمہیں اندھیرے سے اُجالے میں) خود واضح اشارہ کر رہے ہیں کہ سراجاً منیراً

کہہ کر حضورؐ کو روشن چراغ سے تشبیہہ دی گئی ہے کیونکہ اندھیروں سے مراد تاریکی نہیں بلکہ کفر و گمراہی ہے اور اُجالوں سے مراد رشد و ہدایت اور علم و عرفان ہے لہذا یہاں حضورؐ کو حقیقی نور سمجھ لینا قطعاً باطل ہے۔ پس اِن دونوں آیاتِ مستدل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لغوی معنی میں نور نہیں ثابت کیا جا سکتا اس لئے اِن آیات کو عدم سایہ کے اثبات میں (یعنی بطور ثبوت) قبول نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں ایک خاص بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ پہلی آیتِ مستدل (قَدْ جَآءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ) میں لفظ نور سے کچھ تفاسیر محمدؐ مراد لیتی ہیں اور کچھ تفاسیر اس لفظ سے قرآن مراد لیتی ہیں بلکہ بعض مفسرین اس سے اسلام بھی مُراد لیتے ہیں جیسا کہ تفسیر الکبیر و تفسیر مظہری وغیرہ میں فرمایا گیا ہے گویا اس طرح لفظ نور کے مفہوم میں تین احتمال جمع ہو گئے۔ بس اس متفقہ اصول اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال (یعنی جب کسی لفظ کی مراد میں کئی احتمال ہوں تو اس سے استدلال بیکار ہوتا ہے) کے تحت اس آیت مبارکہ سے عدم سایہ کے لئے استدلال خود بخود باطل ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

اب آیئے احادیث کی طرف ـــــ وہ احادیث جو اوپر بطور دلیل پیش کی گئی ہیں یا تو موضوع ہیں یا سخت مجروح۔ اِن احادیث کے بارے میں بھی فرداً فرداً عرض کرتا ہوں۔

سب سے پہلے حدیث ذکوان کو لیجئے (یہ دراصل ایک قول ہے جس کو اثر کہا جا سکتا ہے مگر حدیث ذکوان کے نام سے مشہور ہے) ہم نے اس کو اوّلیت اس لئے دی ہے کہ مابعد کے تقریباً تمام منکرین سایہ علماء کے اقوال اسی قول کے فروع (شاخسانہ) ہیں۔ ذکوان صحابی نہیں، تابعیؒ تھے۔ انھوں نے آنحضورؐ کو دیکھا تک نہ

تھا اور وہ کسی صحابی سے یہ بات سننا بھی بیان نہیں کرتے۔ پھر آخر وہ کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا۔ یہ حدیث دراصل ایک تابعیؒ کا موقوف قول ہے جو حکیم محمد بن علی ترمذیؒ[1] کی کتاب نوادر الاصول سے لیا گیا ہے۔

یہ کتاب انتہائی غیر معتبر ہے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنی تصنیف "بستان المحدثین" میں رقم طراز ہیں:

> اس کتاب میں غیر معتبر اور گھڑی ہوئی احادیث کثرت سے درج ہیں اور اس کی وجہ خود مصنف محمد بن علی یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس تصنیف میں قطعی تدبر اور غور و فکر سے کام نہیں لیا ہے اور نہ میری غرض یہ تھی کہ ان مؤلفات کو میری طرف کوئی منسوب کرے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے دل گھبراتا تھا تو دل بہلانے کے لئے جو دل میں آتا تھا لکھ ڈالتا تھا۔

بالکل یہی بات مشہور صوفی طریقت قیشریؒ نے بھی اپنے رسالہ قیشری میں تحریر فرمائی ہے۔ پس جب کتاب کا مصنف ہی اپنی کتاب کو ناقابل اعتبار قرار دے رہا ہے تو اس کی اسی کتاب سے حدیث ذکوان اخذ کر کے اسے عدم سایہ کی بنیادی دلیل یقین کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اب ذکوان کے اس موقوف قول کے راویوں پر نظر ڈالئے۔ اس کے راوی ہیں عبدالرحمٰن بن قیس الزعفرانی اور عبدالملک بن عبداللہ ابن الولید۔ اوّل الذکر کو تمام ائمہ فن رجال نے جھوٹا اور گھڑنت کرنے والا

---

[1] یہ ترمذی وہ اسمٰعیل ترمذیؒ نہیں ہیں جو صحاح ستہ کی ایک کتاب ترمذی شریف کے جامع ہیں۔

بیان کیا ہے حتیٰ کہ امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ اسے متروک الحدیث فرماتے ہیں امام احمد اسے ناقابلِ التفات کہتے ہیں اور حافظ سیوطیؒ اسے جھوٹا اور گھڑنت کرنے والا کہتے ہیں۔ رہا راوی دوم تو اس کا حال کتب رجال میں نہیں ملتا اس لئے وہ مجہول ہے

حدیث نمبر ۵ بھی حدیث ذکوان کے زمرہ میں ہے کیونکہ یہ بھی ایک غیر معروف شخص کا بے سند قول ہے۔ ابن سبع کو منکرین سایہ محدث کہتے ہیں۔ اگر وہ محدث تھے تو ان کا کوئی علمی کارنامہ پیش کرنا چاہیئے۔ بغیر کسی کارنامہ کے کسی کو محدث، مفسر بنا دینا بے معنی سی بات ہے۔

دوسری حدیث "رَبِّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا (یعنی اے رب مجھے نور بنا دے) صحیح اسناد کے ساتھ کتب معتبرہ میں ملتی ہے۔ اس ضمن میں قابل غور امر یہ ہے کہ اگر حضورؐ کو حضورؐ کی اس دعا سے نور بنا دیا گیا تو اس دعا سے قبل آپ ظاہر ہے کہ نور نہ تھے حالانکہ آیت قد جَآءَکُمْ مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌ سے ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ابتدا ہی سے نور تھے۔ اس لئے آپ کا سایہ نہ تھا۔ یہ ایک واضح تضاد ہے۔ علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگر اس دعا میں لفظ نور کو لغوی معنیٰ میں لیا جائے کہ جس کا غیر مرئی اور غیر مادی ہونے کی وجہ سے لازمہ ہے سایہ نہ ہونا تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اس دعا سے قبل آپ کا سایہ تھا۔ علاوہ ازیں کیا یہ ممکن ہے کہ حضورؐ ایسی خواہش کریں؟ جبکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ نبی اور رسول کی عظمت نبی اور رسول ہونے میں ہے نہ کہ جسمانی حسن و قبح اور نورانیت و غیر مادیت میں۔ فرشتے نورانی ہیں۔ جنات غیر مرئی وجود رکھتے ہیں تو کیا اللہ کی یہ مخلوق مادی وجود رکھنے والے انسان سے زیادہ افضل ہے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر حضورؐ کی یہ دعا کیا معنیٰ رکھتی ہے

سوائے اس کے کہ اے اللہ میری تعلیم و ہدایت سے لوگ اس طرح صحیح راستہ پر آجائیں جس طرح روشنی سے گمراہ، راہ یاب ہوتے ہیں۔

(۳-۴) حضرت عثمان غنیؓ سے مروی حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ عدم سایہ کا سبب حضورؐ کا نور ہونا نہیں تھا بلکہ آپ کے سایہ کے تقدس کے پیش نظر (کہ اس پر کسی کا پاؤں نہ پڑے) اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ ختم کر دیا گویا عدم سایہ بطور معجزہ کے تھا۔ اگر یہ معجزہ تھا تو یقیناً ایک اہم معجزہ تھا۔ اتنا اہم کہ اسے کثرت سے بلکہ تواتر کی حد تک کثرت سے روایت کیا جاتا جیسا کہ دیگر معجزات خصوصاً معراج اور معجزہ شق القمر وغیرہ کے باب میں ہم دیکھتے ہیں مگر حیرت ہے کہ اتنے اہم معجزہ کے لئے کہ جسے صحابہ رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے ایک بھی مستند حدیث نہیں جسے صحیح قرار دیا جائے۔ علاوہ ازیں سایہ کی تشبیہ مستعار ہے جسد رسولؐ سے کیونکہ جسد رسول اصل ہے پس مکہ معظمہ و مدینہ منورہ اور طائف وغیرہ کی سرزمین جس پر آپ چلے پھرے، لیٹے بیٹھے اور آپ کے جسد اطہر سے مس ہونے کی وجہ سے بقول قاضی عیاضؒ عرش سے بھی زیادہ مقدس ہے اس پر قدم رکھنا تو گوارا مگر آپؐ کے سایہ پر پیر پڑ جانا اتنا ناگوار کہ سایہ ہی کا عدم کر دیا گیا۔ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَاب علاوہ ازیں علامہ نسفی نے اس روایت کو اپنی تفسیر مدارک میں بیان تو کر دیا، مگر اس کی سند بیان نہیں کی اور بے سند روایت میں وزن نہیں ہوتا۔

اب رہی حدیث جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی بتائی جاتی ہے وہ درایتاً مندرجہ بالا حدیث سے بھی زیادہ ناقابل حجت ہے اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ کے جسد اطہر کی روشنی سورج اور چراغ کی روشنی پر غالب آجاتی تھی اس لئے سایہ پڑتا

تھا اس مبالغہ بلکہ غلو کی بھی بھلا کوئی حد ہے۔ جس سرزمین اور مکان میں سورج سے بھی کہیں زیادہ روشن حضور اقدسؐ کا وجود مسعود ہو وہاں تو تاریکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ کی گلیاں آپکے وجود اقدس کی روشنی سے رات کو دن کی طرح تابناک رہتی ہوں گی، حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ کی موجودگی کے باوجود آپ کے اطراف میں اندھیرا رہتا تھا۔ آپکے حجرہ مبارکہ میں چراغ روشن کیا جاتا تھا۔ ترمذی شریف کی جلد ۱ کے صفحہ ۱۲۵ پر ایک حدیث آتی ہے جس کے راوی حضرت سیدنا ابن عباسؓ ہی ہیں۔ الفاظ یہ ہیں۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل قبرا لیلا فاسرج لہٗ سراج یعنی نبی کریم ایک رات کو ایک قبر میں داخل ہوئے (تاکہ میت کو قبر میں اتاریں) تو آپؐ کے لئے چراغ روشن کیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ کے ان دونوں اقوال کے تضاد کو دور کرنے کے لئے اول الذکر قول کو موخر الذکر قول پر ترجیح نہیں دے سکتے کیونکہ موخر الذکر قول صحاح ستہ کی کتاب ترمذی شریف کا ہے اس لئے مستند اور قوی تر ہے جبکہ اول الذکر قول کی کوئی مسلسل سند نہیں۔ سند ہے بھی تو وہ منقطع ہے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مبارکؒ کے درمیان تقریباً سو سال کا بعد ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مبارکؒ کے درمیان کم از کم ایک راوی تو ضرور ہی محذوف ہے جو نہیں معلوم ثقہ تھا، منافق تھا یا متہم بالکذب اور اگر یہ کہا جائے کہ حضور اقدسؐ کے جسم اطہر و معطر سے روشنی کا اخراج کبھی ہوتا تھا اور کبھی نہیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا بدیہی ہوگا کہ جب روشنی کا اخراج نہ ہوتا ہوگا تو سایہ پڑتا ہوگا کیونکہ اس حدیث زیر بحث میں عدم سایہ کی وجہ حضور اقدس کے جسد اطہر کا سورج اور چاند سے زیادہ روشن ہونا ہی بیان کی گئی ہے ان دونوں احادیث (آثار صحابہ) پر درایتاً جو

مندرجہ بالا اشکال سامنے آئے ہیں وہ ہی ان احادیث کو ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں لیکن مزید برآں ان غیر مرفوع[1] اور موقوف روایات کی سندیں قائل کے بعد بالکل ہی غائب ہیں یا منقطع ہیں. پس یہ روایات مکمل اسناد کی حامل نہ ہونے کے سبب ضعیف ہی شمار ہوں گی ۔ گو فضائل رجال میں ایسی ضعیف روایات کی قبولیت علماء[2] میں مختلف فیہ ہے تاہم حضورؐ کے بارے میں محتاط راہ یہی ہے کہ ہر ضعیف حدیث کو آپ کی فضیلت میں بلا تکلف قبول کر لیا جائے بشرطیکہ اسکی مخالف قوی تر حدیث موجود نہ ہو ۔ یہاں مندرجہ بالا احادیث کی مخالف ایک قوی تر حدیث موجود ہے جو تین طرق سے مختلف معتبر کتابوں میں موجود ہے. اس حدیث کی مکمل اور صحیح اسناد بھی موجود ہیں. اس قوی تر حدیث کی موجودگی میں مندرجہ بالا تمام ضعیف احادیث غیر مؤثر ہو جاتی ہیں بلکہ لاشئے اور کالعدم کے درجہ میں پہنچ جاتی ہیں کیونکہ ان میں عدم سایہ کے اثبات کے لئے کچھ بھی قوت باقی نہیں رہ جاتی ۔ یہ قوی تر مخالف حدیث "حدیث صفیہ" کے نام سے موسوم ہے

---

[1] حضور اقدسؐ سے براہ راست حدیث سننے کو رفع کہتے ہیں اور ایسی حدیث جو حضورؐ سے براہ راست سنکر بیان کی گئی ہو اسے مرفوع کہتے ہیں. پہلا آدمی تو اسے یعنی مرفوع حدیث کو حضورؐ سے براہ راست سنتا ہے اور ازاں بعد وہ حدیث تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے راوی کے ذریعہ نقل ہوتی چلی جاتی ہے ۔ [2] علامہ الجزائری توجیہ النظر (صفحہ ۲۱۹) میں فرماتے ہیں وذھب قوم الی عدم جواز الاخذ بالحدیث الضعیف فی ای نوع کان یعنی ایک جماعت اسکی قائل ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل واعتماد کسی صورت میں بھی درست نہیں چاہے وہ فضائل کی ہو یا قصص کی ۔ بہت سے علماء کا یہی مذہب ہے ۔

۷ ا سی

اور مسند امام احمد حنبلؒ میں دیکھی جا سکتی ہے علاوہ ازیں مجمع الزوائد جلد ۴ (ص ۳۲۳) میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ طبقات ابن سعدؒ جلد ۸ مطبوعہ بیروت (ص ۱۲۶) میں بھی یہ حدیث بطور شاہد دیکھی جا سکتی ہے۔ بہرکیف حدیث یہ ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ناخوشگوار واقعہ کی بنا پر حضرت زینبؓ سے ناراض ہو گئے اور آپؐ نے ان کے حجرے میں جانا بند کر دیا۔ اس ترک تعلق کو تقریباً ڈھائی ماہ گذر گئے۔ حضرت زینبؓ مایوس سی ہو گئیں۔ اس عالم مایوسی میں ایکدن انھوں نے دیکھا کہ ایک سایہ حجرے کے دروازہ سے اندر آیا۔ ایک لمحہ کے لئے حضرت زینبؓ نے سوچا کہ یہ سایہ تو مرد کا ہے مگر کس کا؟ حضورؐ نے تو تشریف لانا ہی بند کر دیا ہے۔ تب ہی حضورؐ بنفس نفیس اندر داخل ہوئے حدیث کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

فلما کان شهر ربیع الاول دخل علیها فرأیت ظله فقالت ان هذا الظل رجل وما یدخل علی النبی صلی اللہ

ربیع الاول کا مہینہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے گھر تشریف لائے۔ حضرت زینب کو پہلے آپ کا سایہ نظر آیا تو آپ ہی آپ کہنے لگیں کہ سایہ

لے مسند احمد کے راوی یہ ہیں۔ عبدالرزاق۔ جعفر بن سلیمان۔ ثابت نبانی، سمیہ (ہاشمیہ) حضرت صفیہ بنت حی (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۳۱ اور تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۹۵ تا ص ۹۸ (محصلہ) کے مطابق یہ رواۃ ثقہ ہیں)

لہ اس کے راوی ہیں۔ عفان بن مسلم، حماد بن سلمہ، ثابت نبانی۔ شمیہ۔ حضرت عائشہ یہ سب رواۃ تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۳۱، ص ۲۳۴، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۷۱، تقریب ص ۴۷۳ کے مطابق ثقہ ہیں

علیہ وسلم فمن ھذا فدخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما رأت قالت یا رسول اللہ ما ادری ما اصنع حین دخلت

کسی مرد کا ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو میرے پاس آتے ہی نہیں پھر یہ کون شخص ہو سکتا ہے۔ اتنی سی پنچ ہیں بیٹھیں کہ رسول اللہ بنفس نفیس اندر پہنچ گئے آپ کو دیکھکر وہ فرطِ مسرت میں کہنے لگیں یا رسولؐ خدا زہے نصیب آپنے تشریف آوری سے نوازا میں اس عنایت کے تشکر میں کیا کروں۔

اثبات سایہ میں کتنی واضح حدیث ہے۔ اس صحیح الاسناد حدیث کی موجودگی میں صرف وہی غلو پسند حضرات عدم سایہ پر یقین رکھ سکتے ہیں کہ عجوبہ پسندی جن کا مزاج ہو لہٰذا وہ کسی نبی کی نبوت پر اس وقت تک ایمان لانے کیلئے تیار نہیں جب تک کہ اس کو سرتاقدم مافوق الفطرت یقین نہ کرلیں اس میں شک نہیں کہ نبی سے مافوق الفطرت باتیں ظہور میں آتی رہتی ہیں لیکن یہ سب نبوت کی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کیطرف سے ظاہر ہوتی ہیں جنھیں معجزہ کہا جاتا ہے۔ اگر عدم سایہ کو بطور معجزہ بھی کہا جائے تب بھی اس کے اثبات کے لئے آثارِ صحابہ کی ضرورت ہے کیونکہ وہی چشم دید گواہ ہو سکتے ہیں لیکن ایسی کوئی روایت مکمل اور صحیح اسناد کے ساتھ نہیں ملتی اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ یہ وصف بعد والوں کے غلوئے عقیدت کی پیداوار ہے ورنہ صحابہ کرامؓ سے یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے اپنے نبی کے اس وصفِ خاص کو بیان کرنے سے کفِ لساں کیا ہوگا جبکہ انھوں نے حضورؐ کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا کو والہانہ بیان کیا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارکہ کا اتنا مکمل ریکارڈ اپنے بعد آنے والوں کو منتقل کیا

کہ جسکی مثال آج تک کوئی قوم پیش نہ کر سکی رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اس طویل بحث کے بعد مزید کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی تاہم اس نہج سے بھی اس مسئلہ پر غور فرمائے کہ اگر حضور لغوی معنیٰ میں نور تھے تو آپ پر جادو کرنا کیونکر ممکن ہوا۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے لبید بن اعصم کاہن کے ذریعہ آپ پر جادو کرایا گیا۔ کافی عرصہ آپ اس جادو کے زیر اثر تکلیف برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع فرمایا اور جادو کے دفیعہ کے لئے سورہ فلق اور سورہ ناس نازل فرمائیں۔ کیا نور اور غیر مرئی اشیاء بھی جادو سے متاثر ہو سکتی ہیں؟ اگر نہیں تو ماننا پڑے گا کہ آپ ایک مادی وجود رکھتے تھے اور ہر مادی وجود[1] سایہ رکھتا ہے بشرطیکہ وہ Transparent نہ ہو کہ جس کے آر پار روشنی کی شعاعیں گزر سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضور اقدسؐ کا جسم اطہر ایسا نہ تھا۔

---

[1] اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ۔ الخ

(پارہ ۱۴ سورہ نحل آیت ۴۸)

(۷) آنحضورؐ کا سبب تخلیق کائنات ہونا:

بڑا ہے عرش سے بھی ان کا پایا
کہ سب کچھ جن کی خاطر ہے بنایا

(سعادت یار خاں رنگین)

لگاتا ہاتھ نہ پتلے کو ابوالبشر کے خدا
اگر وجود نہ ہوتا تمہارا آخر کار

(مولانا محمد قاسم نانوتوی)

باعث ایجاد عالم ہے وہی
علت غائی آدم ہے وہی

(ابوالحسن حسن کاندھلوی)

وہ حسن ملیح جس کی پوشاک
لولاک لما خلقت الافلاک

(صفی لکھنوی)

وہ کون احمد مرسل شفیع ہر دو سرا
جو خلق کا سبب اور باعث معاد نفوس

(مومن)

وہ جن کی ذات والا وجہ تخلیق دو عالم ہے
وہ جن کی ذات لولاک لما تشریف لے آئے

(ناطق گلاؤٹھی)

کبھی وجود میں آتا نہ عالمِ امکاں
صدف میں علم الٰہی کے تھا یہ دُرِّ یتیم

(جعفر خاں اثر)

وہ جس کو فاتح ابواب اسرار قدم لکھیے
بنائے عرش و کرسی باعثِ لوح و قلم لکھیے

(حفیظ جالندھری)

اس مضمون کو شعراء حضرات کثرت سے نظم کرتے ہیں جبکہ قرآن اس باب میں خاموش ہے لکثر علماء کہتے ہیں کہ کسی مجذوب کے اس قول لولاک لما خلقت الافلاک کو حدیث کا نام دے دیا گیا ہے کیونکہ یہ حدیث بلفظہٖ صحاح ستہ اور احادیث کی دیگر کتب معتبرہ میں نہیں ملتی جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فتاویٰ عزیزیہ (ص ۳۰۸) میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث ان کی نظر سے نہیں گزری۔ یہ خیال ایک مشہور محدث کا ہے جسکی احادیث کے باب میں وسعتِ نظر مسلّمہ ہے۔ ویسے بھی یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یہ کسی نامعلوم شخص کا قول ہے جو وہ عالم بیخودی میں کہہ اٹھا ہوگا۔ گو اس قول کا مضمون چند روایتوں میں وارد ضرور ہوا ہے لیکن ان روایات کی صحت بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی وہ روایات یہ ہیں۔

۱۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث الحاکم نے المستدرک میں "فلولا محمد ما خلقت آدم ولولا محمد ما خلقت الجنۃ والنار" کے الفاظ سے روایت کی ہے حاکم نے اس کے متعلق کہا ہے ھٰذیٰ حدیث صحیح الاسناد (یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے) لیکن امام حافظ ذہبیؒ نے حاکم پر نقد کیا ہے اور کہا ہے ھٰذا اَظُنُّہٗ

مَوْضُوعًا (میرے گمان میں یہ موضوع ہے) علمائے فن حدیث نے فرمایا ہے کہ نقد حدیث میں امام ذہبیؒ کا پایہ بلند تر ہے۔ تنہا امام حاکم کا نقد اس حد تک قابل قبول نہیں جس حد تک امام ذہبیؒ کا۔

۲۔ حضرت عمرؓ کی حدیث جسے طبرانی نے 'معجم صغیر' میں اور الحاکم نے "المستدرک" میں اور بیہقی نے 'دلائل النبوۃ' میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں ولولا محمد ماخلقتک کے الفاظ آئے ہیں۔ الحاکم اسے صحیح الاسناد کہتے ہیں لیکن امام ذہبیؒ نے ان پر نقد کرتے ہوئے اس کو موضوع قرار دیا ہے اور اس کے راوی عبدالرحمن بن زید بن مُسلم کے متعلق لکھا ہے "واھیٌ" (یعنی بہت ضعیف) اور اگلے راوی عبداللہ بن مسلم الفہری کے متعلق بھی نقد کرتے ہیں "لا ادری من ذا" (یعنی مجہول) اور میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں "خبر باطل رواہ البیھقی فی دلائل النبوۃ" (یہ روایت جسے امام بیہقیؒ نے "دلائل النبوۃ" میں نقل کیا ہے باطل ہے) حافظ ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں امام ذہبیؒ کے اس کلام کو بغیر کسی نقد کے نقل فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امام ذہبی کے مندرجہ بالا فرمودات کو تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری حدیث حضرت سلمان فارسیؓ کی ہے جسے محدث ابن الجوزی نے "کتاب الموضوعات" میں نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ "لولاک یا محمد ما خلقت الدنیا" کے متعلق فرماتے ہیں "ھٰذا حدیث موضوع لا شک فیہ وفی اسنادہ مجھولون وضعفاء وقال الدارالقطنی ابوالسکین ضعیفٌ وابراھیم بن الیسع ویحییٰ البصری متروکان (یعنی یہ حدیث بلا شک و شبہ موضوع ہے کیونکہ اس کے راوی مجہول اور ضعیف ہیں اور امام دارالقطنی نے فرمایا کہ ابوالسکین ضعیف ہیں اور ابراہیم بن الیسع

اور یحییٰ البصری متروک[1] ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زیرِ بحث حدیث یا دوسرے الفاظ میں ادا کیا گیا اس کا مضمون محدثانہ حیثیت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور جو حضرات بھی اس مضمون کو بیان کرتے ہیں تو اس کی وجہ حدیث کا صحیح علم نہیں بلکہ صوفیانہ غلو آمیز عقیدت ہے یا یہ کہ اپنے ظاہری حسن اور خوبصورتی کی بنا پر یہ بات ان کے اذہان نے اس حد تک قبول کر لی کہ یہ ان میں سے بعض افراد کی عقیدت اور بعض افراد کے عقیدے کا جزو بن گئی اور کیفیت یہ ہو گئی کہ اب اس کی مخالف ہر آواز سے ان کے جذبات عقیدت و محبت کو ٹھیس پہنچتی ہے اس لئے وہ اس مسئلہ میں علمی گہرائی کے ساتھ غور کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے

حاصلِ تحریر یہ کہ حدیث "لولاک لما خلقت الافلاک" حدیث نہیں بلکہ کسی صوفی کا قول ہے۔ اس کا مضمون جو مختلف احادیث میں وارد ہوا ہے وہ احادیث امام ابوذہبی معروف ناقدِ فنِ حدیث کی تحقیق کے مطابق موضوع ہیں۔ پس بطور فضائل و مناقب بھی اس مضمون کو نظم کرنا درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ضعیف احادیث فضائل کے باب میں چل جاتی ہیں مگر جب ان کا ضعف اس حد تک شدید ہو کہ انھیں موضوع کے درجہ تک پہنچا دے تو فضائل و مناقب کے لئے بھی قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔

---

[1] متروک۔ جن سے حدیث لینا ترک کر دی جائے۔

(۸) عرشِ اعظم کا تصوّر

عرش و کرسی کو قدم تم نے دی نور و ضیا ر — آسماں تم نے شب معراج کو روشن کیا
جس جگہ وہم ملائک کو نہیں ملتی ہے جا — رنگ و بو گلشن کی جنت سے بڑھا دی بر ملا
واں کے تم مسند نشیں ہو یا محمد مصطفےٰ

(نظیر اکبر آبادی)

عرش بریں ایوانِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلم
خلد سرا بستانِ محمد صلّی اللہ علیہ وسلم

(کافی مراد آبادی)

یہی ہیں اوّل، یہی ہیں آخر، یہی ہیں ظاہر، یہی ہیں باطن
یہی تھے عرشِ خدا کی زینت، روایت کن فکاں سے پہلے

(جرم محمد آبادی)

زہے عزت و اعتلائے محمد
کہ ہے عرشِ حق زیرِ پائے محمد

(مولانا احمد رضا بریلوی)

ہے بیتاب جس کے لئے عرش اعظم
وہ اِس رہروِ لامکاں کی گلی ہے

(مولانا احمد رضا خاں بریلوی)

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں
وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ۔
عَلَى الْعَرْشِ (پ اعراف ع ۱۳- آیت ۵۴)	پھر عرش پر استوا فرمایا۔

یہ ہے وہ آیتِ کریمہ جس میں زیرِ بحث عرش کا ذکر ہے۔ عرش کے متعلق معلومات کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر بہت اوپر ایک تخت ہے جسے چار فرشتے اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور یہ تخت جلوہ گاہِ ایزدی ہے لیکن علماء نے عرش کا باطنی مفہوم بھی بیان کیا ہے اور اس پر کافی بحث بھی کی ہے۔ ان کی طویل بحثوں کا حاصل یہ امکان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات کے بعد اس وسیع کائنات کا ایک مرکز قرار دیا اور اس مرکز سے اپنی تجلّیات کا ظہور فرمایا۔ شاید عرش سے مُراد یہی مرکز ہو۔ علاوہ ازیں بعض علماء کے ظن میں عرش سے مراد اقتدارِ کائنات ہے اور اس پر استوا فرمانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے کائنات کی تخلیق کے بعد عنانِ اقتدار اپنے دستِ قدرت میں لے لی۔ بہر حال یہ تمام مفاہیم ظنّی ہیں کیونکہ استوائے عرش متشابہات میں سے ہے جسکا صحیح تصور و ادراک ہمارے لئے ممکن نہیں اور اسی لئے حضورِ اقدسؐ نے کچھ ایسے انداز سے اس کا ذکر فرمایا ہے کہ ہمیں اس کا ضرورت کے مطابق کچھ فہم حاصل ہو جائے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ استوائے عرش متشابہاتؔ میں شمار کیا جاتا ہے اور ہم اس کا فہم و ادراک بھی نہیں رکھتے نیز عرش کی ہیئت و حقیقت کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ ہی جاننے کی قدرت ر

ؔ قرآن و حدیث کے وہ مضامین جنکے معنیٰ و مطالب ہمیں نہیں بتائے گئے اور نہ ان کے کھوج لگانے کی اجازت دی گئی ہے۔

وصلاحیت رکھتے ہیں تو اس پر اپنے تخیلات کے محل تعمیر کرنا کوئی دانائی نہیں۔ بہتر تو یہی ہے بلکہ انتہائی ضروری ہے کہ عرش پر ہر قسم کی خیال آرائی سے گریز کیا جائے اور اس پر گفتگو بھی اسی وقت کی جائے جب ناگزیر ہو اور وہ بھی انتہائی محتاط انداز میں۔ عرش سے متعلق اس قسم کے لایعنی مضامین کہ عرش اعظم حضورؐ کے زیر قدم ہے یا آپؐ کی گلی کے چکر لگانے کے لئے بیقرار اور بیتاب ہے وغیرہ نظم کرنا عرش کا ایک مضحکہ خیز تصور پیش کرنا ہے۔

(۹) میم کا پردہ :

احد نے صورت احمد میں اپنا جلوہ دِکھلایا
بھلا پھر کس طرح سے کوئی اس کا مرتبہ جانے

(نواب حیدر حسین خاں حیدر)

تو احد ہے نام تیرا احمد بے میم ہے
زیب پایا تجھ صفت سے ہر ورق قرآن کا

(سراج اورنگ آبادی)

معانی قل ھو اللہ احد کے ہیں یہاں ناسخ
برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمد کا

(ناسخ)

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزم شیرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

(اقبال)

سو جانیں امیر احمدِ بے میم پہ قربان
خلعت احدیت کا بھی پایا شبِ معراج

(امیر مینائی)

ایک دینی ماہنامے کے سوال وجواب کے کالم میں کسی نے سوال کیا تھا کہ رسول پاک افضل ہیں یا قرآن پاک۔ مجیب کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ اتنے فالتو صفحات کہ اس سوال کے جواب میں سر کھپاتا۔ چنانچہ اس نے جو جواب دیا وہ بڑا ہی دلچسپ تھا وہ یہ کہ "کیا آپ کے پاس کوئی اور مفید بات سوچنے کیلئے نہیں؟" بس اسی قسم کے کچھ مفکر اور کچھ شاعر بھی ہوتے ہیں جن کی فکر اور جن کی سوچ، نئے نئے نکتے ہی تلاش کرتی رہتی ہے ایسے ہی کسی مفکر نے یا کسی شاعر نے یہ نکتہ پیش کیا کہ احمد اور احد میں صرف میم کا پردہ" ہے۔ جس عقلمند نے یہ مہمل شوشہ چھوڑا اس نے اس نکتہ سے اپنے غلو پسند جذبۂ عقیدت کی تسکین حاصل کی لیکن سنجیدہ اصحاب فکر جو دور رس نگاہ رکھتے ہیں اس نکتہ پر چونک پڑے کیونکہ ان کی نگاہ میں عقیدۂ توحید بچوں کا حروفی کھیل نہیں ہے۔ بات تو بظاہر صرف ایک حرف کی ہے کہ احمد کا میم اگر حذف کر دیا جائے تو احد بن جاتا ہے لیکن ان کی باریک بیں اور دقیقہ رس نگاہ نے دیکھ لیا کہ اس نکتہ میں کس قسم کا ذہن بول رہا ہے۔ لیجئے ایسا ہی ایک اور نکتہ ملاحظہ فرمایئے خدا (اللہ) اور جُدا (غیر اللہ[1]) بتایئے کتنا فرق رہا اللہ اور غیر اللہ میں صرف ایک نقطے کے محل کا یعنی معمولی سا فرق بلکہ اس سے بھی کم جو احمد اور احد میں بتایا گیا ہے لیکن چونکہ "پردہ میم" والا نکتہ سیدنا و مولانا حضور نبی کریم سے متعلق ہے اس لئے اس پر وجد کیا گیا۔ شعرا نے اسے نظم کیا یہاں تک کہ اقبال جیسے فلسفی شاعر تک عالم خود رفتگی میں والہانہ طور پر اس نکتہ کو نظم کر گئے والہانہ جذبات عقیدت، جب وارفتگی و بے خودی کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ تو عالم خود فراموشی میں الوہیت کی حدود نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جب اس قسم

---

[1] خدا سے جُدا یعنی خدا کے علاوہ جو بھی مخلوق ہے وہ بہر حال غیر اللہ ہی ہے

کی نکتہ سنجیاں ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہیں تو سری کرشن کو اوتار اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی نکتہ سنجیاں اور ایسا مرموز انداز بیان کہ جس سے غلط فہمیاں جنم لیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند تھا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث آئی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اخرج مسلم من ابوھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایقولن احدکم عبدی وامتی کلکم عبد اللہ وکل نسآئکم اماء اللہ

(امام) مسلم نے ذکر کیا کہ ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی نہ بولے کہ "میرا بندہ" اور "میری بندی" "تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے کہ عبد کے معنی غلام کے بھی ہیں اور اسی مفہوم کو لیکر لوگ اپنے غلاموں کو عبدی کہہ کر پکارتے تھے لیکن پھر بھی حضور اقدسؐ نے غلام کو عبدی کہکر مخاطب کرنے سے منع فرمایا ہے تاکہ اس ذو معنی لفظ سے کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ ایک طرف تو حضورؐ کی اس احتیاط کو دیکھئے کہ آپ ایسے مرموز اور ذو معنی الفاظ جو موہم شرک ہوں کو استعمال کرنے سے منع فرمائیں اور اسکے مقابل دوسری طرف ہمارے شعراء کے "احمد بے میم" اور "میم کا پردہ" جیسے نکتوں پر مبنی ان اشعار کو ملاحظہ فرمائے جو بطور نمونہ اس مضمون کے آغاز میں میں نے پیش کئے ہیں آپ تسلیم کریں گے کہ یہ مرموز اشعار صالح تاویل کے بغیر منشائے رسولؐ کے سخت مخالف ہیں اس قسم کی مرموز اور موہم نکتہ آفرینی کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ پس نعت گو شعراء کو ایسے مرموز نکات سے گریز کرنا چاہیئے۔

(۱۰) حضور کا تقابل دیگر انبیاء کے ساتھ

مسیحؑ اس کی خرگاہ کا پارہ دوز　　　　تجلی طور اس کی مشعل فروز
خلیلؑ اس کے گلزار کا باغباں　　　　سلیمانؑ سے کئی مہردار اس کے ہاں
خضرؑ اس کی سرکار کا آبدار　　　　زرہ ساز داؤدؑ سے دس ہزار

(میر حسن)

فضائل کا جب تقابل پیش نظر ہو تو یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ جس شخص کے کمالات پر حضورؐ کے فضائل و کمالات کی فوقیت بیان کی جائے اس شخص کا دنیوی اور اُخروی مرتبہ کیا ہے۔ اگر وہ صرف دنیوی مراتب رکھنے والی کوئی شخصیت ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے تمام تر کمالات کے باوجود حضور اقدسؐ کے سامنے پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتی لیکن اگر وہ شخصیت کسی نبی یا رسول کی ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ حضورؐ کے تقابل میں اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا جا رہا ہے وہ اس کی شخصی و نبوی شان کے منافی یا کم سے کم درجہ میں بھی کاسرِ عظمت تو نہیں۔ مثال کے طور پر حضرت صدیق اکبرؓ کو لیجئے کہ جب آپ کو حضورؐ نے حضرت عائشہؓ کے لئے اپنا پیام دیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ کیا عائشہؓ آپ کی بیوی بن سکتی ہیں حالانکہ وہ آپ کے بھائی کی (یعنی میری) بیٹی ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔

او تصلح لہ وھی ابنۃ اخیہ　　　کیا عائشہؓ آپ کی بیوی بن سکتی ہے حالانکہ وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

انت اخی وانا اخوك فی الاسلام (زرقانی جلد ۳ ص ۲۳۰)　　　تم میرے بھائی ہو اور میں تمہارا بھائی ہوں لیکن اسلام میں (نہ کہ نسب میں)

یہ مکالمہ مظہر ہے اس بات کا کہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے علم میں یہ بات تھی کہ حضورؐ ان کے دینی بھائی تھے لیکن باوجود اس علم کے آپ نے زندگی میں ایک بار بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اخی (بھائی) کہہ کر مخاطب نہیں کیا کیونکہ یہ تخاطب حضورؐ کے احترام کے منافی تھا۔ پس اگر کسی امر حقیقی و واقعیٔ کا اظہار و بیان کسی نبی کے لئے ادنیٰ ترین درجہ میں بھی اہانت کا پہلو لئے ہوئے ہو تو یہ مطلقاً ناجائز ہے۔ لیکن اگر یہ اہانت آمیز بیان کسی امر غیر واقعیٔ (مفروضے) کے بارے میں (جیسا کہ مندرجۂ بالا اشعار میں ہے) ہو تو یہ ایک نبی کی اہانت کی مد میں آکر سخت تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر بھی اس کی واضح مثال ہے:

آج یوسف بھی ان کی غلامی میں ہیں
تو نے دیکھا زلیخا ہمارا نبی

مشیت ایزدی کے تحت حوادث زمانہ نے حضرت یوسفؑ کو اس منزل پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا جہاں انہیں عزیز مصر کے ہاتھوں بکنا پڑا مگر وہ حضورؐ کے غلام تو بہر حال نہ تھے، نہ حقیقتاً اور نہ مجازاً۔ البتہ حضرت یوسف کے ساتھ پیش آمدہ واقعہ کو بطور واقعہ بیان کرنا فی نفسہٖ معیوب نہیں اور نہ ایک نبی کی اہانت بشرطیکہ اظہار واقعہ کا انداز اہانت آمیز یا تضحیک کا پہلو لئے ہوئے نہ ہو۔

(۱۱) جبرئیل امین کو حضورؐ کے درکا دربان کہنا:

آپ کا رُتبہ ہے ایسا کہ جناب جبریل
آپ کے در کے ہیں دربان، رسُولِ عربی (داغ)

کہتے ہوئے سُنا نہیں کیا جبرئیل کو
خادم ہوں بارگاہِ رسالت پناہ کا

(بیخود دہلوی)

جبرئیل علیہ السلام جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ایک جلیل القدر فرشتہ ہیں اور ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں۔ حضورؐ کی عظمت و شان کے مقابلہ میں ہر غیر نبی خواہ وہ قد و قامت میں بالا اور عزّت و عظمت میں کتنا ہی اعلیٰ ہو ایک ذرّۂ بے مقدار ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی آپ کے سامنے ایسے ہی ہیں جیسے چاند کے سامنے ستارے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام حضورؐ کے مقابلہ میں کتنے ہی فروتر سہی اللہ تعالےٰ کے نزدیک ایک مقامِ خاص رکھتے ہیں۔ تمام فرشتوں پر ان کو فوقیت و فضیلت حاصل ہے۔ پیغاماتِ الٰہیہ کے امین اور ان کی انبیاء و رُسل تک ترسیل کا انھیں شرف حاصل رہا ہے۔ اس نظریہ سے ان کو خادم یا دربان کہنا ان کی اپنی مخصوص نفسِ عظمت کے پیشِ نظر غیر مناسب لگتا ہے۔ ان کے فضائل متقاضی ہیں کہ حضور کے ساتھ ان کا ذکر کرتے وقت ان کے مراتب کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ پس اس قسم کے اشعار جیسا کہ اوپر درج کئے گئے ہیں نہ کہے جائیں تو بہتر ہے۔

باب چہارم

نعت نبیؐ کے مشروع موضوعات

نعت کے مروجہ غیر مشروع موضوعات پر گفتگو تمام ہوئی۔ ان کا محاسبہ اسلام کی بنیادی روح (FUNDAMENTAL SPIRIT) اور قرآن وحدیث کی روشنی میں کیا جا چکا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعت کے موضوعات کیا ہونے چاہئیں۔ سیرت پاک کے وہ کون سے پہلو ہیں جو نعتیہ شاعری کے موضوع بن سکتے ہیں۔

نعت کے موضوعات کی دو اہم بنیادیں ہیں۔ ایک وہ کہ جس میں آنحضورؐ کی سوانح و شخصیت اور اس کا حسن آجاتا ہے۔ اس کی حیثیت قطعیٔ انفرادی ہے جنھیں ہم معتقدات[1] کے تحت لیتے ہیں۔ بعض شخصیتیں خود محترم ہوتی ہیں اور وہ معاشرہ میں اس بلند مقام پر متمکن ہوتی ہیں جہاں احترام کی آنکھ اور محبت کی نظر بڑھ کر خود ان کے قدم چومتی ہے۔ اس پہلو سے آنحضورؐ کی شخصیت ایک انفرادی شخصیت ہے جس میں آپؐ کا نبی ہونا، رسول ہونا، خاتم النبیین ہونا۔ تمام عالم کے لئے رحمت ہونا، محبوبِ خدا ہونا، حسب و نسب میں اعلیٰ ہونا جسمانی حسن میں اپنی مثال آپ ہونا، قول و فعل میں یکساں ہونا، بے پناہ اخلاقی اوصافِ حمیدہ (حلم و حیا، پرہیزگاری و توکل، محبت و اخوت، نجدت و شجاعت سخاوت و فیاضی، قناعت و انکساری وغیرہ وغیرہ) سے متصف اور

---

[1] یہاں معتقدات سے مراد عقائد ضروریاتِ دین ہی نہیں بلکہ وہ تمام باتیں بھی مراد ہیں جو حضورؐ کے متعلق ثابت ہیں۔

ان میں بے مثال ہونا غرضکہ معجزات اور دیگر تمام صفات و کمالات مع ان کمالات و اوصاف کے جو آپ کے خصائص میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپؐ کی شخصی اور انفرادی خوبیوں کے ضمن میں آتے ہیں ان معتقدات کو نعت کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

دوسری بنیاد وہ ہے جس میں آپ کے اعمال، افعال اور تعلیمات آتی ہیں۔ انسان اپنے اعمال صالحہ اور بلیغ تعلیمات کے سبب بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ایسی تعلیمات جو ساری کائنات کے لئے قوانین فطرت اور ضوابط زندگی کے طور پر محفوظ کر لی گئی ہوں۔ پھر ایسے اعمال جن کو تمام مخلوق نے اپنے لئے مثالی (IDEAL) سمجھا ہو۔ اعمال و افعال میں آپؐ کی مکمل زندگی یعنی طرز معاشرت و عبادت، تجارت و معاملات، حکومت و جہاد، افعال قبیحہ سے فطری گریز وغیرہ سب ہی چیزیں آتی ہیں۔ اور تعلیمات کے ضمن میں وحدانیت کی تبلیغ، رسالت پر ایمان، شعار اللہ کا احترام، ارکان اسلام کی پابندی، عقائدِ اسلام کا ایقان اور زندگی سنوارنے کے لئے اسلامی طرز عمل۔ ان دو بنیادی موضوعات سے ہٹ کر نعت نبی کی تعمیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ مندرجہ ذیل دو مضامین جو اگرچہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ لیکن انھیں بھی متذکرہ بالا موضوعات سے بالکل ہی الگ نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ان میں کا ہر ایک ان موضوعات کی کسی نہ کسی فرد سے متعلق ضرور ہے۔

(۱) آنحضور سے متعلق و منسوب اشیاء و شخصیات سے عقیدت و محبت مثلاً مدینہ منوّرہ، مکہ مکرمہ، گنبد خضرا، خاک طیبہ وغیرہ، نیز آپ کی آل و اصحاب ازواج مطہرات اور والدین وغیرہ۔

(۲) آنحضورؐ کی شخصیت سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار۔

متذکرہ بالا تمام موضوعات کو بنیاد تسلیم کرنے کے باوجود جب تک آنحضورؐ کی مکمل شخصیت کا ممکن حدود تک ادراک وعرفان نہ ہو۔ ان بنیادوں پر نعت کا حسین وجمیل قصر تعمیر کرنا ممکن نہیں۔ دراصل آنحضورؐ کی شخصیت کا (حدودِ ممکنہ تک) ادراک وعرفان ہی نعت کی اصل ہے اور یہ ادراک ہی حب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تابندگی اور پائندگی دیتا ہے۔ یہ ادراک جتنا وسیع ہوگا اتنی ہی نبی کریمؐ سے والہانہ محبت ہوگی۔

حکماء و فلاسفہ کا ایک گروہ کہتا ہے کہ نظام عالم محبت پر قائم ہے۔ حکمائے اسلام میں مسکویہہ نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ انسان لذت، نفع اور خیر کا طالب ہے۔ اس کے نزدیک محبت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ قسم جس کا سبب لذت ہے، دوسری محبت وہ ہے جس کا سبب نفع ہے اور تیسری وہ جس کا سبب حصولِ خیر ہے۔ مؤخرالذکر محبت ہی اس کے نزدیک دائمی اور لازوال ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپؐ کی تعلیمات سے محبت کا سبب بھی حصولِ خیر ہی ہے اور ہونا چاہیئے۔ لہٰذا آنحضور سے عقیدت و محبت کا سبب حصول خیر ہوا۔ اور حصول خیر کے لئے ہمیں جس عمل، جس جستجو وسعی سے گزرنا پڑتا ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ اگر ہم آپؐ سے صحیح معنوں میں ظاہری نہیں بلکہ باطنی زبانی نہیں عملی، لفظی نہیں معنوی محبت کرتے ہیں تو آپ کی صفات عالیہ، فضائل متکاثرہ محاسن جمیلہ ورفیعہ پر غور وخوض ہمارے لئے ناگزیر ہوگا اور اس کے نتیجہ میں ہمیں جو ایمان و ایقان حاصل ہوگا اس کے تحت ہم جو کچھ بھی کہیں گے اس میں سچائی اور خلوص کی تابناکی ہوگی اور وہ مؤثر بھی ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے بہکنے کے تمام امکانات بھی

ختم ہو جائیں گے۔ ایسی شاعری روح کو راح اور صدر کو انشراح بخشے گی۔

اوپر جن موضوعات کو نعت کے لئے معتبر قرار دیا گیا ہے ان میں بھی حُبّ النبیؐ اور حضورؐ کے صفات و کمالات کی معرفت ممکن حدود تک شرط ہے لیکن اس پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ان سب کا تعلق وسعت علم سے ہے۔ اگر ان موضوعات کی ایک ایک فرد پر اختصاراً بھی گفتگو کی جائے تو یہ ایک ضخیم کتاب بن جائیگی جو فی الحال مطلوب و مقصود نہیں۔ علاوہ ازیں یہ موضوعات اتنے دقیق بھی نہیں کہ ان کی تشریح اور وضاحت کی ضرورت ہو۔ البتہ جن موضوعات کو غیر مشروع سمجھا گیا۔ ان کی اختصاراً اور تسلی بخش حد تک تشریح کر دی گئی ہے۔ باقی تمام مشروع موضوعات پر متعلقہ کتب کا سیر حاصل مطالعہ ہر نعت گو شاعر کے لئے ضروری ہے۔ تاکہ نعت کے کسی بھی شعر میں نادانستہ غلط بیانی کا احتمال ہی ختم ہو جائے صرف اٹکل قیاس اور شنیدہ باتوں کو حضورؐ سے منسوب کر کے نظم کر دینا جرأت بیجا ہے یہاں سے میں براہ راست اپنے قارئین کی طرف مخاطب ہوتا ہوں۔

حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس نے میرے متعلق غلط بیانی کی (یعنی وہ کہا جو میں نے نہیں کہا) وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے (الحدیث) اسی لئے فاضل بریلویؒ نے نعت گوئی کو تلوار کی دھار پر چلنے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ مقام ادب ہے۔ یہاں آپ کے ذہن و قلب کو ہر گام پر کانپ کر اور افکار کو لرز لرز کر صفحۂ قرطاس پر اترنا ہے۔ پس نئے اور اچھوتے مضامین پیش کرنے کا یہاں وہ جذبہ نہ ہونا چاہیئے جو غیر نعتیہ شاعری (غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ) میں عام طور پر کارفرما ہوتا ہے۔ یہاں چند لمحوں کی واہ ایسا نہ ہو کہ اللہ اور اسکے رسول کا عتاب بن جائے۔ راقم

الحروف کی مخلصانہ رائے ہے کہ صرف ان ہی مضامین کو نظم کر کے کہ جن کی نشاندہی "مشروع موضوعات" کے تحت کی جا چکی ہے اپنے جذبۂ نعت گوئی کے لئے تسکین فراہم کریں۔ علاوہ ازیں چند ایسی معتبر کتابوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے کہ جن سے آپ کو صحت کے ساتھ مشروع موضوعات کی تفصیلات کا علم حاصل ہو جائے اور آپ حضورؐ کے متعلق صحیح معلومات کے ابلاغ کا ذریعہ بنیں۔ دراصل یہی وہ نعت گوئی ہے جسے مباح اور مستحب کہا گیا ہے اس سلسلہ میں نعت کے بلند پایہ شعراء کے کلام کا مطالعہ بھی نعت کے صحیح اسلوب اور تیکنک کو سمجھنے اور اسے مزید مؤثر بنانے میں معاون ہوگا کیونکہ علم و ادب کی راہ میں اگلا قدم اٹھانے سے پیشتر راہروانِ گزشتہ کے نقوشِ پا کو رہبر بنانا بھی منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔

شرعی اصطلاحات

۱. اثر - صحابیٔ رسول، تابعی یا تبع تابعین کا قول، فعل اور حال ۔ جمع آثار۔

۲. اجماع - تمام علمارِ حق کا اتفاق۔

۳. تابعیؒ - وہ شخص جسے حالت ایمان میں کسی صحابی سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ہو اور ایمان ہی کی حالت میں دُنیا سے رخصت ہوا ہو۔

۴. تبع تابعین - وہ حضرات جنھوں نے بحالتِ ایمان کسی تابعیؒ سے مُلاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں دُنیا سے رُخصت ہوئے ہوں۔

۵. تواتر - ہر دَور میں راویوں کی اتنی کثیر تعداد سے کسی حدیث کا مسلسل روایت کیا جانا کہ جن کا بوجہ کثیر تعداد جھوٹ پر متفق ہونا عقل ناممکن سمجھتی ہو تواتر کہلاتا ہے اور ایسی حدیث کو حدیث متواتر کہا جاتا ہے۔

۶. حجت - دلیل۔

۷. حدیث - لغوی معنی بات ۔ اصطلاحاً رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل اور تقریر کو حدیث کہا جاتا ہے ۔ آنحضورؐ کے سامنے کوئی کام کیا گیا یا آپ نے کوئی طریقہ رائج پایا اور اسے آپؐ نے نہیں روکا اسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں اور یہ بھی سنّت و حدیث ہی کے زمرہ میں ہے۔

۸. حدیث قدسی - جس حدیث کی نسبت نبی کریمؐ خدا کی طرف فرمائیں مثلاً اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

۹. درایت - حدیث کا جو مفہوم عقل وقواعد سے اخذ کیا جائے۔

۱۰۔ راوی۔ وہ شخص جو کسی حدیث یا اثر کو نقل کرے۔ رواۃ جمع۔

۱۱۔ رفع۔ نبی کریمؐ سے براہِ راست حدیث روایت کرنا۔

۱۲۔ سند۔ حدیث روایت کرنے والوں کا سلسلہ۔ یعنی اگر کسی حدیث (یا اثر) کو چار اشخاص یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے سنکر روایت کریں تو یہ پورا سلسلہ سند کہلائے گا۔

۱۳۔ شاہد۔ ایک حدیث کسی صحابی نے روایت کی ایسی ہی دوسری حدیث کسی دوسرے صحابی سے مل جائے جس سے پہلی کی تائید ہوتی ہو تو وہ شاہد کہلائے گی۔

۱۴۔ صحابی۔ وہ خوش نصیب شخص جس نے ایمان کی حالت میں حضور اقدسؐ سے مُلاقات کی سعادت حاصل کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں دُنیا سے رُخصت ہوا ہو۔

۱۵۔ صحاح ستہ احادیث کی چھ معتبر کتابیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح تسلیم کی جاتی ہیں۔ (۱) بخاری شریف (۲) مُسلم شریف (۳) ابوداؤد شریف (۴) ترمذی شریف (۵) نسائی شریف (۶) ابن ماجہ شریف۔

۱۶۔ صحیح وہ حدیث جو احادیث کے اصولِ صحت پر کامل ہو یعنی سند متصل ہو، راوی سیرت و کردار کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں، حافظہ درست اور صاحبِ فراست ہوں اور روایت شاذ نہ ہو نیز معلّل بھی نہ ہو۔

سند کا متصل ہونا یہ کہ تسلسل کے ساتھ تمام راوی موجود ہوں یعنی شروع سے آخر تک کوئی راوی غائب نہ ہو معلّل یعنی ایسا مخفی نقص

پایا جانا جسے ماہرین حدیث ہی معلوم کر سکتے ہیں۔

شاذ وہ روایت جو گو ثقہ راوی سے مروی ہو لیکن عام طور پر مشہور روایت کے خلاف ہو خواہ یہ مخالفت سند میں ہو یا متن حدیث میں

۱۷۔ ضعیف — وہ حدیث جس میں صحیح حدیث کی تمام شرائط یا بعض شرائط میں نمایاں کمی پائی جاتی ہو مثلاً کسی راوی کا جھوٹا یا متہم بالکذب ہونا وغیرہ۔

۱۸۔ عقیدہ — یقین قلب۔ دین عقائد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ دین کے بعض عقائد عقائدِ ضروریات دین کہلاتے ہیں جنکی تفصیل "ایمان مجمل اور ایمان مفصل" میں موجود ہے۔ یہ عقائد ایمان کے لئے شرط ہیں بعض عقائد ضروریات اہل سُنّت کہلاتے ہیں مثلاً قبر میں نکیرین کے سوالات پُل صراط وغیرہ۔

۱۹۔ غریب — ایسی حدیث جسکے سلسلہ سند میں کسی دَور میں ایک ہی راوی ہو غریب کو فرد بھی کہتے ہیں

۲۰۔ فن رجال — یہ ایک فن ہے جسے ائمہ دین نے ایجاد کیا۔ یہ محدثین کی اصطلاح ہے۔ تمام راویوں کے اخلاق و کردار اور ان کے دیگر حالات پوری پوری تحقیق کے بعد معلوم کر کے یکجا کئے گئے ہیں۔ اس فن کے ذریعہ کسی بھی حدیث کے کسی بھی راوی کے متعلق یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں۔ اس فن سے متعلق متعدد کتابیں دستیاب ہیں جنمیں احادیث کے راویوں پر بحث کی گئی ہے۔

۲۱۔ متروک — وہ راوی جو عدم اعتماد (بوجہ کذب وغیرہ) کی بنا پر ترک کر دیا

گیا ہو یعنی اس سے حدیث کا لیا جانا ترک کر دیا گیا ہو۔

۲۲۔ متشابہات — وہ امور جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جن پر غور و خوض یا کھوج کرنا شرعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

۲۳۔ متن — حدیث کی اصل عبارت یا الفاظ۔

۲۴۔ مجروح — جس پر ناقدین فن نے جرح کی ہو۔ یعنی مشتبہ خواہ وہ حدیث کا راوی ہو یا خود حدیث۔ جراح (الجراح والتعدیل) تنقیدِ شخصیت کو کہتے ہیں جو راوی پر کیجاتی ہے۔ اس کی راویانہ زندگی کے احوال کو جانچا جاتا ہے بلحاظ اس کی سنجیدگی و غیر سنجیدگی، اسکے شیوخ و تلامذہ اس کے عقائد و اعمال اس کے ضبط و ثبت، اخلاق و کردار اور اس پر معاصرین کے اقوال اور شہادتیں وغیرہ۔

۲۵۔ مجہول — وہ راوی جس کا کوئی حال نہ معلوم ہو سکا ہو۔

۲۶۔ محکم — ایسی واضح المفہوم حدیث جو ابہام و احتمالات سے خالی ہو۔ ایسی حدیث سے احکام شریعہ اخذ کئے جاتے ہیں۔

۲۷۔ مرفوع — وہ حدیث جو براہِ راست رسول کریمؐ سے روایت کی گئی ہو یعنی جس حدیث کی روایت کا سلسلہ حضورؐ تک پہنچتا ہو۔

۲۸۔ منسوخ — وہ آیت جسے کسی دوسری بعد والی آیت قرآنی نے منسوخ کر دیا ہو یا وہ حدیث جسے کسی دوسری بعد والی حدیث نے منسوخ کر دیا ہو۔ یعنی ایک حکم کے بعد دوسرا حکم جو پہلے والے حکم کو منسوخ کر دیتا ہے ناسخ کہلاتا ہے۔

اور پہلا حکم جو دوسرے حکم سے ختم ہوا منسوخ کہلائے گا۔

۲۹۔ منقطع — وہ حدیث جس کی سند میں ایک یا زائد راوی ساقط ہو گئے ہوں۔

۳۰۔ موضوع — من گھڑت اور خود ساختہ حدیث۔

۳۱۔ موقوف — وہ حدیث جو صحابی یا تابعی پر جا کر ختم ہو جائے۔

۳۲۔ نص — قرآن و حدیث کی عبارات سے ثبوت اور کلام کرنے والے نے جس مقصد سے کلام کیا اس مقصد کے لئے جو عبارت متکلم نے بولی ہو اسے نص کہتے ہیں۔

شمسؔ بدایونی کی دوسری کتابیں

دید و دریافت

بدایوں کی شعری و ادبی روایات
معروف و غیر معروف شعراء پر تحقیقی و تنقیدی
مقالات کا مجموعہ۔ سال اشاعت ۱۹۸۱ء
قیمت پچیس روپے

از خاکِ بدایوں

بدایوں کے چند قدیم اہم
تحقیقی و تعارفی مضامین
سال اشاعت ۱۹۸۳ء۔ قیم

شعری ضرب الامثال (حصہ اول)

اردو کے ان ضرب المثل اشعار کا انتخاب جنہیں
ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں بلا تکلف استعمال کرتے
ہیں لیکن کتابی شکل میں دستیاب نہ ہونے کے سبب جو
ہمارے ذہنوں ہی میں مرتسم ہیں۔ اشعار کے متن کی صحت
اور شعراء کے صحیح اسمائے کے ساتھ مع مقدمہ و حواشی
یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔
سال اشاعت ۱۹۸۴ء۔ قیمت پندرہ روپے

حقائق و بصائر

وہ مقالات جو ملک کے معیاری رسائل میں
شائع ہوئے جن میں نئی آگہی بھی ہے اور تحقیقی
تلاش و سعی بھی، تنقیدی بصیرت بھی ہے اور دلکش
اسلوب بھی۔ ۱۲ مقالات پر مشتمل یہ کتاب تحقیقی و
تنقیدی ذوق رکھنے والوں کیلئے کافی م...
کرتی ہے۔ سال اشاعت ...
قیمت: چالیس روپے

مکاتیبِ تبسم

فانی بدایونی کے ہم
پیشہ اور دوست منشی منوہن لال ماتھر تبسم (ایڈوکیٹ)
کے ادبی خطوط کا مجموعہ۔ مع مقدمہ و حواشی۔
سال اشاعت ۱۹۸۷ء قیمت تیس روپے

شعری ضرب الامثال (حصہ دوئم)

اردو کے ضرب المثل اشعار کا انتخاب مع مقدمہ و
حواشی۔ سال اشاعت ۱۹۸۸ء
قیمت پندرہ روپے